شاہد اختر

شاہد اختر کا فکشن زندگی کے ہمہ گیر محسوسات کو گرفت میں لینے اور تجزیاتی یا مفہومی تاثر قائم کے بغیر ایک ناظر کی نگاہ سے افسانوی سچویشن دیکھنے کا عمل ہے۔ انھوں نے Surrealistic انداز میں منظر نامہ کو کردار بنانے کا انفرادی عمل تخلیق کیا ہے اور فکشن کو ایک جہتی مفہوم کے بجائے ہمہ جہتی مفاہیم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہد اختر کے افسانوں میں نفسیاتی دروں بینی نہیں بلکہ نفسیاتی تصورات کا اجتماعی اثر اور تہذیبی زوال کے وہ زلزلے نمایاں ہوتے ہیں جس کو دیکھ کر پڑھنے والا خود بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

محمود ہاشمی

شاہد اختر کے افسانے عصری، معاشرتی، سماجی تضادات اور اقدار کے زوال کی جس انداز میں تجسیم کرتے ہیں وہ ان کی تخلیقی قوت کا حوالہ ہے۔ ان کے لکھنے کی صلاحیت کی داد دیتا ہوں۔

بلراج کومل

شاہد اختر

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

نام کتاب : شہرذات (ناول)

مصنف : شاہد اختر

پتہ : 88/592، النور اپارٹمنٹ، فلیٹ نمبر 205، سیکنڈ فلور، پریم نگر، کانپور

مستقل پتہ : 227/2، جوہی لال کالونی، کانپور-208014

موبائل : 91-9450143117,91-9161403557

مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی

کمپوزنگ : (مولانا) عبدالباقی قاسمی

سرورق : حمید اختر (صاحبزادے)

تزئین سرورق : ٹیم عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Shah'r-e-Zaat *(Novel)*

by **Shahid Akhtar**

1st Edition : 2022 Price: Rs. 300/-

ISBN : 978-93-93998-95-8

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6 011-23260668
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- راہی بک ڈپو، 734 اولڈ کٹرہ، پریاگ راج، یو. پی. +91 7905454042
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ +91 9358251117
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-4 +91 9304888739
- کتاب دار، ممبئی +91 9869321477
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد +91 9246271637
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد. +91 9325203227
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ +91 9433050634
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر +91 9797352280
- امرین بک ایجنسی، احمد آباد، گجرات +91 8401010786

arshia publications

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)

Mob: +919971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

خلد آشیانی

امّی

اور ابّو کے نام

جن کی تربیت اور دعاؤں

کی وجہ سے

حرف شناسی کا شعور آیا

"پھر تو اک دن ڈوب جائے گی صدائے احتجاج
ہم اگر آواز کی لے روز کم کرتے رہے"

(شعیب نظام)

علم یہ نہیں کہ بات کتنی گہری ہے
اور الفاظ کتنے مشکل ہیں
علم یہ ہے کہ بات کتنی ضروری ہے
اور الفاظ کتنے سادہ ہیں۔۔؟

" in the end
We Will all be come
stories"
(Margaret At wood)

شہر ذات اور شاہد اختر

شاہد اختر کا نام اُردو دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس سے قبل ان کے تین افسانوں کے مجموعے، 'برف پر ننگے پاؤں'، 'مونٹی' اور 'خواب گینے' منظر عام پر آ چکے ہیں اور ایک ناول 'شہر میں سمندر' بھی قارئین سے داد وصول کر چکا ہے۔

انھوں نے اردو کو کئی بہت اچھی کہانیاں دی ہیں جن میں مونٹی، ایک بلی کی موت، برف پر ننگے پاؤں بکولی، تنویر گزیدہ اور دیمک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے فن کو اردو کے جن برسر آوردہ ناقدین نے سراہا ہے ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شیم حنفی، پروفیسر نیر مسعود، جناب محمود ہاشمی، پروفیسر شافع قدوائی، جناب مہدی جعفر، پروفیسر وہاب اشرفی، ندا فاضلی، بلراج کومل اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے علاوہ بہت سے اہم نام شامل ہیں۔ درج بالا فہرست یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اب انہیں مزید کسی سرٹی فکٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

شہر ذات کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ یہ ناول اپنے قاری کو Engage کرتا ہے۔ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اصل میں زبان پر شاہد کی گرفت بہت مضبوط ہے سادہ اور سلیس زبان کے ساتھ استعارے گویا بہتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے جزئیات نگاری میں وہ چیزوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لگتا ہے ہم ان

منظروں کو دیکھ رہے ہیں۔ انسانی زندگی کا ان کا مشاہدہ بھی انہیں دوسروں سے الگ کر دیتا ہے۔ وہ بہت حساس فنکار ہیں اور اپنے احساسات کو قاری تک منتقل کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

خرم جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ بھی بہت حساس ہے۔ اس کردار کی خوبی یہ ہے کہ وہ اظہار میں زیادہ یقین نہیں رکھتا مگر ہر چیز کو بہت گہرائی سے محسوس کرتا ہے جس کے نتیجے میں خود اس کے اندر ٹوٹنے بکھرنے کا عمل برابر جاری رہتا ہے آج کے زمانے میں خرم جیسے ہر شخص کا یہی مقدر بھی ہے۔

ناول افضل مسلم کی موت کے اعلان سے شروع ہوتا ہے خرم فطری طور پر زندگی اور موت کے فلسفے پر دیر تک سوچتا رہتا ہے جو ایک فطری امر ہے آگے خرم شدید گرمی کے بارے میں سوچتے سوچتے موسم کی تبدیلی پر غور کرنے لگتا ہے کہ کس ملک میں ایک سرسبز وشاداب خطہ ریگستان میں تبدیل ہو گیا یہاں استعارے کو کس سادگی سے استعمال کیا گیا ہے یہ شاہد کی زبان کا کمال ہے۔

ماں کی ہمدردیاں ہمیشہ اپنے کمزور بیٹے کے ساتھ ہوتی ہیں مگر بدلتے ہوئے زمانے میں یہ کلیہ بھی تبدیل ہوتا جا رہا ہے شاہد نے خرم کی ماں اور ایک جھگی میں رہنے والی ماں کے حوالے سے اس تبدیلی کو بہت فنکاری کے ساتھ نشان زد کیا ہے۔ کیا آج ماں اپنے بچے کی نفسیات سمجھنے سے قاصر ہوتی جا رہی ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے جس کا جواب سوچتے ہوئے بھی روح کانپ جاتی ہے۔ یہی تو ایک بے غرض رشتہ بچا تھا دنیا میں کیا وہ بھی معرض سوال میں آ رہا ہے۔

شاہد شروع میں ہی ایک مشتعل ہجوم کا ذکر کر کے پوری فنی ہنرمندی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس منظر کی ناول میں شمولیت آخر میں جا کر واضح ہوتی ہے۔

ماموں کا مزاحیہ کردار بہت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے اتنا بھولا اور سادہ لوح انسان جو شروع میں خالص مزاحیہ کردار بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اپنے بیٹے کی

گرفتاری کے بعد یہ کردار ہزاروں کرداروں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ شاہد نے ساری تگ ودو کو بہت پر اثر طریقے سے پیش کر کے آج کے حالات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔

بھائی جان اور جمیلہ بھابھی کے کردار ہمارے شاندار ماضی کے وہ کردار ہیں جو انسانی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار ہمارے اور شاہد کے دیکھے ہوئے ہیں اسی لیے ان کی کردار نگاری اور جذبات کے بیان میں شاہد بہت کامیاب ہیں یہ کردار اب شاید ہمارے بچوں کو دیکھنے کو نہ ملیں۔

انتقال کی خبر اور قبرستان میں تدفین سے لے کر آخری مراحل تک کا بیان بہت جاندار ہے ان منظروں کو دیکھتے تو ہم سب ہیں مگر ان پر اس طرح شاید سب لوگ غور نہیں کرتے۔ شاہد نے قارئین کے سامنے گویا آئینہ رکھ دیا ہے بورڈ سے پیک نکال کر دوسرے بورڈ میں جس پھرتی اور ذہانت سے لگایا گیا ہے وہ آج کی نسل کی ذہنیت کو بے پردہ کرنے کے لیے عمدہ استعارہ ہے۔

خرم کے دوست اوجھا کا کردار بھی بہت سلیقے سے پینٹ کیا گیا ہے اب یہ کردار نایاب نہیں ہیں مگر اس کی پیش کش بہت سلیقے سے کی گئی ہے۔ ماتھے پر تلک ہاتھ میں کلاوا اور گلے میں رودراکچھ کی مالا چکن اور بریانی کھاتے ہوئے ہندو راشٹر کا ذکر یہ دوہرے کردار اب عام ہوتے جارہے ہیں۔ اور شاید زیادہ خطرناک بھی۔

خرم کی محبوبہ انترا ایک ذہین اور عام لڑکیوں سے بالکل الگ پورے ناول میں وہ بہت کم سامنے آتی ہے مگر اس کی شخصیت کا بھرپور تاثر قائم کرنے میں ناول نگار کامیاب ہے۔

خرم کی موت کا ذکر ناول میں بہت غیر جذباتی طور پر کیا گیا ہے۔ فرقان کے جیل سے رہا ہونے پر اس کا بھائی ریحان بتاتا ہے کہ انہیں بھیڑ نے مارڈالا۔

اس غیر جذباتی بیان کے پیچھے جو بیچارگی، مایوسی اور جذبات کا ہیجان ہے وہ سب ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ جب اس طرح کے واقعات برابر ہونے لگیں تو

ان کا بیان اسی طرح کیا جائے گا۔گویا حادثات کا بار بار ہونا اب معمول کی بات ہوگئی ہے۔یہ ایک جملہ ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ ناول ماضی قریب، حال اور مستقبل کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے اپنے فطری انجام تک پہنچتا ہے۔

ماضی قریب میں بھائی جان، جمیلہ بھابھی اور ماموں جیسے سادہ لوح کردار ہمارے سامنے آتے ہیں گھر رشتے داروں سے بھرے رہتے تھے رشتے دار صرف رشتہ دار ہوتے تھے امیر اور غریب کی تفریق نہیں ہوتی تھی۔جمیلہ بھابھی کی کنبہ پروری کی خاموش اجازت بھائی جان نے گویا دے رکھی تھی ہر طرف زندگی جیسے چھلکتی رہتی تھی حلیم اور پائے کی دعوت سے سب مل کر لطف اندوز ہوتے تھے مگر ماموں جیسے بھولے اور معصوم کردار معاشرہ میں عنقا نہیں ہوتے تھے۔ان کرداروں کو ہماری نسل نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔شاہد نے اس کردار کو ایک جیتے جاگتے کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔خود خرم جیسا حساس نوجوان بھی اسی ماضی کے غبار سے جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔شاہد نے ان کرداروں کو بہت خوبصورتی اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

حال میں ماموں کے بیٹے فرقان کی گرفتاری اور اس کے بعد کورٹ کچہری کے چکر بے گناہی کے باوجود زندگی کے دس سال جیل میں گزارنا اس غم میں ماموں جیسے کردار کی موت (یہ ماموں کی نہیں اصل میں معصومیت کی موت ہے) اور آخر میں خرم کی Mobg Lynching کو جس غیر جذباتی انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ خوف ناک ہے۔یہاں انہیں بھیڑ نے مار ڈالا۔جس طرح ادا کیا گیا ہے اس سے دہشت اور خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔گویا اب ایسا ہونا عام سی بات ہے جس پر جذباتی ہونا یا حیرت کا اظہار کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی یہ حالات کی سنگینی کی طرف واضح اشارہ ہے۔

مستقبل میں اوجھا جیسے دہرے چہرے والے انسان اور بجلی کا پلک جھپکتی سے

تبدیل کر کے اپنی بجلی کا بل بچانے والے خودغرضی کے اشارے وہ سب کہہ دیتے ہیں کہ ہم کس تاریک راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس سے زیادہ یہ سوال پریشان کرنے والا ہے کہ ماں کا کردار جو ایثار اور قربانی کی علامت تھا کیا مادہ پرستی کے دور میں دھیرے دھیرے یہ کردار بھی تبدیل ہو جائے گا۔ کیا ماں جیسا مقدس رشتہ بھی جواب معرض سوال میں آنے لگا ہے۔ مستقبل میں کیا وہ بھی اپنے معنی کھو دیگا۔ اس طرف شاہد نے جس طرح اشارہ کیا ہے اور ماں کے کردار کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ روح فرسا ہے اور ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو ہماری روح تک کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کیا ہمیں کل اس سفاک حقیقت سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔

پورا ناول شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور حرم کے کردر کے ذریعہ باہر سے زیادہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو بہت فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول جتنا خارج کو اپنے احاطے میں لیتا ہے اس سے زیادہ داخلی دنیا میں اتھل پتھل مچاتا ہوا اپنے انجام کو پہنچتا ہے اسی لیے اس کا عنوان بھی ''شہر ذات'' ہے۔ اس سے مناسب عنوان شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

میں اس عمدہ ناول کے لیے شاہد اختر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادب کے سنجیدہ قارئین کو یہ ناول اپنی طرف ضرور متوجہ کرے گا۔

—شعیب نظام

عرض مصنف

''شہر میں سمندر'' میرا پہلا ناول تھا جس کی اشاعت 2005ء میں ہوئی تھی۔
اس وضاحت کی ضرورت مجھے یوں پیش آئی کہ ایک ناول لکھنے کے لیے کسی تخلیق کار پر جو ذمے داری اور کچھ اندیشے سے مسلط ہوتے ہیں، میں اُس آزمائش سے نبرد آزما ہو چکا ہوں۔ ذہن میں یہ خوف تو بالکل بھی نہیں ہے کہ نحیف شانے ناول کا بار اُٹھا بھی پائیں گے یا نہیں۔؟

پھر سوال اُٹھتا ہے کہ دوسرے ناول کی تخلیق کے لیے مجھے سترہ برس انتظار کیوں کرنا پڑا۔۔؟ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ خواہش ہی نہیں ہوئی اور خواہش نہ ہونے کا سبب اطمینان بخش خام مواد کی عدم دستیابی تھی۔

حالاں کہ کوئی کارنامہ میں نے اس بار بھی انجام نہیں دیا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی اتنی کوشش ضرور کی ہے کہ طباع اور سنجیدہ قاری کو کسی طرح پُورا ناول پڑھوانے میں کامیاب ہو جاؤں۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔بس۔۔۔؟

اس اہم اور بنیادی شرط کے زیرِ اثر ''شہرِ ذات'' کا محاسبہ، محاکمہ میرے لیے ممکن تھا جو میں نے کرلیا۔ اب آپ کی باری ہے۔۔؟

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے پہلے ناول کے عنوان میں بھی شہر تھا اور اس بار بھی لاشعوری طور پر شہر در آیا ہے۔ تخلیقی عمل کا مرحلہ کسی دوسرے سے پہلے خود سے جھگڑنے اور شکست و فتح سے نمٹنے کا ہی ہے اور یہی وہ مقام ہے جب لکھنے والا کسی حد تک مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔

اب بازار میں کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین صرف معیار اور تخلیق کا بہت عمدہ ہونا ہی نہیں ہے، بازار کی شرطوں کو پورا کرنا بھی ہے، ہر چند کہ یہ بہت عارضی ہے۔ ادب میں کھوٹا سکہ کہیں نہیں چلتا۔ کوئی کتنی ہی تگ و دو کر لے۔

ذاتی طور پر فکشن مجھے بہت مشکل صنف معلوم ہوتی ہے۔ ناول نگاری تو مشکل ترین کام ہے۔ اس کے باوجود گذشتہ دہائی میں جتنی وافر تعداد میں ناولوں کی اشاعت ہوئی ہے، یہ حیران کن ہے اور خوش آئند بھی۔ خوش آئند اس لیے کہ اس سخت پتھر پر ضربیں لگتی رہنی چاہئے۔ کون جانے کس تیشہ کے وار سے یہ معرکہ فتح ہو جائے۔ اچھے کے ساتھ ظاہر ہے کہ خراب تخلیقات بھی سامنے آئیں گی بلکہ کمزور اور غیر معیاری کتب کی بہتات ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا لکھنے والا ہو، ہمیشہ ارفع واعلیٰ ادب ہی خلق نہیں کر سکتا۔

پچھلے دس برسوں میں کچھ اہم اور بہت اہم ناول منظر عام پر آئے ہیں۔ اُن میں کئی کو ابھی وہ مقبولیت اور اہمیت نہیں ملی جس کے وہ حقدار ہیں مگر مجھے یقین ہے زیادہ دن تک انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مارکٹنگ میں پیچھے رہ جانے والے وہ تمام اہم ناول اپنے آپ اس مقام پر پہنچ جائیں گے کہ جہاں پر اُن کا حق ہے۔ کسی کو بھی اس معاملے میں رخنہ ڈالنے کا نہ حق حاصل ہے اور نہ یہ اُس کے اختیار میں ہے۔ تاریخ میں یہ سب پہلے بھی ہوتا آیا ہے مگر وقت کی چھلنی سب سے بہتر چھانتی ہے۔

شوق جب جنوں بن جائے تو صرف دستار کی ہی فکر پچتی ہے۔ سر کے بارے میں کون سوچتا ہے۔ اس ناول کو شروع کرنے سے پہلے کچھ سُراغ اور مبہم سے چند اشارے

مجھے ملے تھے۔ تخلیقی سفر میں بہت کچھ ویسے بھی طے شدہ نہیں ہوتا۔ کاغذ پر اُترنے سے قبل وہ عکس یا ہیولے جیسے ہی تھے۔ کچھ آگے بڑھ کر دیکھنے کی خواہش ہوئی تو آئنہ سے گرد صاف ہوتی ہوئی نظر آئی۔

کسی ناول پر فوری اور شدید ردِ عمل خواہ مثبت ہو یا منفی، اُس ناول کا مستقبل متعین نہیں کرسکتے۔ کسی فن پارے کے معیارات اور قدر و قیمت طے ہونے میں وقت درکار ہوتا ہے۔ سو سال سے اُوپر کی اردو فکشن کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

تحریکیں اور رُجحانات ادب میں آتے جاتے رہیں گے۔ ناقدین حضرات افسانے اور ناول کی شعریات اور ساختیات پر مباحث کرتے رہیں گے پرانی Theories ردّ ہوتی رہیں اور نئی بنتی رہیں گی۔ معیاری اور بڑا ادب بھی خلق ہوتا ہی رہے گا۔ جس طرح ایک بھی کلمہ پڑھنے والا زمین پر موجود رہے گا، قیامت نہیں آئے گی۔ ٹھیک اُسی طرح ایک بھی ذی علم اور سنجیدہ صاحب قلم موجود رہے گا، اعلیٰ ادب کے امکانات بھی باقی رہیں گے۔

یہ ناول لکھنے کی ضرورت مجھے کیوں پیش آئی، کسی اور سے پہلے یہ سوال ہم زاد نے مجھ سے دریافت کیا تھا۔ اُسے تو یہ کہہ کر کہ کیوں نہیں لکھنا چاہئے میں نے خاموش کردیا تھا۔

ہم نے دنیا جہاں کی سیاحت تو کرلی مگر ''شہر ذات'' کی خاک چھاننے کی سعادت بھی ملی کہ نہیں۔ اگر یہ حوصلہ اور ظرف نصیب ہوا ہے تو شائد کچھ حاصل ہوجائے۔ ماضی کی بازیافت کتنوں کا مسئلہ ہے حال اب بھی ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ نہیں اور مستقبل کے اندیشے سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے شائد آپ کو بھی کہیں نظر آئے ہوں۔

ہم نے کیا کھویا کیا حاصل کیا ہے؟ اس نوحہ کی بازگشت، ممکن ہے کہ اس ناول میں کہیں سنائی دے جائے، قدروں کے زوال کا کرب محسوس کرنے کی میں نے بھی کوشش کی ہے۔ اپنی بات کتنی صداقت اور ایمانداری سے کہہ پایا، یہ فیصلہ قاری اور وقت

کو کرنا ہے۔

ہمیں نہیں معلوم ہم کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ۔۔۔ ہمارے در و بام ۔۔۔ کھیت کھلیان ۔۔۔ ہمارے شہر ۔۔۔ بلکہ ملک جانے اب اور کیا دیکھنے کے منتظر ہیں۔ تھر تھر کانپتا ہوا ہمارا اعتبار ۔۔۔ ہماری شناخت اور وسط میں لٹکا ہوا ہمارا مستقبل ۔۔۔؟

ہمارے ذہنوں سے تاریخ کے آبگینے نوچے جا رہے ہیں۔ ہمارا مذہبی اور ثقافتی نظام تاراج ہو رہا ہے۔ ایسے ہی کچھ سوالوں کے تعاقب میں اس ناول کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔

مطالعہ کے دوران آپ اگر کہیں پر افسردہ ہو جائیں، ایک ساعت کے لیے ٹھہر کر کچھ سوچنے لگیں یا کہیں زیرِ لب مسکرانے سے خود کو نہیں روک پائیں تو بس میری محنت وصول ہے ۔۔۔ راقم کو اور چاہیے ۔۔۔ بھی ۔۔۔ کیا ۔۔۔؟

—— شاہد اختر

صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ لوگ دفتر یا کارخانوں کے لیے نکلنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ باورچی خانے میں برتنوں کی کھڑپٹر یہ بتا رہی تھی کہ خواتین ناشتہ یا کھانا پکانے میں مصروف ہیں اور تبھی محمدی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر افضل مسلم کی موت کا اعلان ہوا۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' برجستہ خرم کی زبان سے نکل گیا۔ عصر بعد تدفین کی اطلاع بھی جاری کر دی گئی۔ خرم کے لیے یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ مرنے والے سے باقاعدہ واقف تھا بلکہ بہت دنوں تک اُسکی دوستی بھی رہی تھی۔ وہ کافی دنوں سے بیمار تھا۔ خرم کو یہ معلوم تو ہوا تھا مگر اصل صورتِ حال کا اندازہ تو دیکھنے کے بعد ہوا۔ ابھی تین دن پہلے کی ہی تو بات ہے جب اماں نے اُسے پھر ٹوکا تھا کہ ''تم ابھی تک افضل کو دیکھنے نہیں گئے، ویسے دن بھر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہو'' بس وہ اٹھا اور فوراً ہی چلا گیا۔ وہ دونوں مدرسے میں کافی عرصہ تک ساتھ پڑھے تھے، بلکہ اُس وقت خاصی دوستی بھی تھی لیکن بڑے ہونے کے بعد قربتیں کم ہونے لگیں۔ اب بہت سی اموات ایسی بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن پر ہم پہلے بہت دنوں تک حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

جنوب میں وہ دائیں طرف والی گلی میں دوسرا مکان تھا افضل مسلم کا۔ وہ خوبرو اور صحت مند آدمی تھا۔ جسامت کے اعتبار سے بھی وہ قابلِ رشک تھا۔ اُس کی اُٹھان

شروع سے ہی بہت اچھی تھی مگر اُس روز تو خرم اپنا تحیّر بھی چھپانے میں ناکام تھا۔ آج موت کی اطلاع نے اُسے اتنا افسردہ نہیں کیا جتنا اُس دن وہ مغموم ہوا تھا۔ عجیب اضمحلال کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اُس کی حیرت میں مزید اضافہ اُس وقت ہوا جب ایک جملہ سے اُس نے ماحول بدلنے کی شعوری کوشش کی۔ ایسے وقت میں بھی کسی کو یہ سب سوجھ سکتا ہے۔ خرم کے اندر تک وہ بات نقش ہوگئی تھی۔ افضل مسلم نے کہا تھا کہ ''بھائی آپ کے یہاں پائے بہت عمدہ پکتے ہیں۔ کسی دن اہتمام ہو تو مجھے بھی شامل کرلیجیے گا''۔ اتنا آسان ہوسکتا ہے اس وقت یہ گفتگو کرنا۔؟ خرم نے اندر ہی اندر اپنے آپ سے یہ سوال کیا۔ خرم جواب میں کچھ کہتا کہ افضل پھر گویا ہوا۔ ''بھائی کیا آجکل شکار پر نہیں جارہے ہیں۔؟ اگر کبھی جائیں تو نیلے کے کباب کھانے کی بڑی خواہش ہورہی ہے''۔ اس بار خرم نے خود کو یکجا کیا اور بولا کہ ''اب شکار کرنے والے خود ہی شکار ہورہے ہیں، پھر بھی کہیں سے بندوبست ہوتا ہے تو انشاءاللہ آپ کو ضرور کھلائیں گے''۔ خرم نے جیسے تیسے بات پوری کی۔ وہ افضل مسلم کی بیماری کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بسترِ مرگ پر لیٹے اس شخص نے خرم کو بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وقفہ میں خاموشی کی ساعتوں نے جو دل خراشی کی ہے، وہ ضبط کرنا خاصہ مشکل ہے۔ کتنا حوصلہ اور ہمت ہے اس آدمی میں۔ تیز جھکڑ دار آندھیوں کے شور میں افضل مسلم کی آواز کی بازگشت خرم کے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔ کچھ دیر بعد یہ شور کچھ کم ہوا تو موت کی ہیبت سایوں میں تبدیل ہوکر لہرانے لگی اور وہ تھوڑا خوف زدہ بھی ہوا۔

خرم اب موت کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ موت کی منطق اور فلسفے کا بہت علم رکھنے والے، جنھوں نے اس موضوع پر بہت پڑھا یا لکھا ہے تو کیا وہ بیجو انڈے والے سے زیادہ جانتے ہیں۔۔۔۔ موت کے اسرار؟'' یہ ایک طرح کی خود کلامی تھی۔ وہ اس وقت ان باتوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے سر جھٹکنے سے کسی کے خیالوں کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہو مگر خرم کے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں تھا۔

بجو انڈے والا پیچھے والی گلی کے آخری میں نکڑ کے پاس خرم کی پیدائش سے بہت پہلے سے گھر کے اندر سے ہی انڈوں کی خرید وفروخت کیا کرتا تھا۔ پہلے صرف بیچنے کا ہی کام ہوتا تھا۔ خاصہ بڑا لکھوری اینٹوں والا گھر تھا۔ خوب ڈھیر ساری مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ اماں بتاتی ہیں کہ بجو نام پر لوگوں کو بہت اعتراض تھا۔ شروع میں خوب بحث ومباحث بھی ہوئے پھر اچانک ایک دن مسجد کی طرف رہنے والے ایک ضعیف آدمی نے یہ گتھی سلجھادی۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کا لڑکا سعودیہ سے آیا تھا۔ ایک دن ان کی دکان پر آکر انڈے کے بجائے بیضہ طلب کیا۔ جلد ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اُس نے کہا معاف کیجئے گا۔ میرا مطلب انڈے سے ہے۔ لڑکے نے وضاحت بھی کردی۔ چند بچوں نے یہ نیا لفظ سُن لیا اور اگلے دن سے اُس کی گردان شروع ہوگئی۔۔۔۔ اچھا بھلا نام تھا اُس بیچارے کا۔۔۔ انوار۔۔۔ مگر سب بیضہ کہنے لگے۔ پھر وہ کسی دن بیضہ سے بیضو اور پھر بجو پر آکر معاملہ ختم ہوگیا کہ اب زبان کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔

وقت کے ساتھ انڈوں کی تجارت بھی تبدیل ہوگئی۔ انڈے بھی مشین سے بننے لگے۔ اب گھر بھی پہلے سے کافی چھوٹے ہوگئے تھے۔ بجو نے بھی فارم کے انڈے بیچنے شروع کردیئے۔ کنبہ بڑھا۔۔۔ بچوں کے بچے بڑے ہونے لگے۔ اخراجات بڑھ رہے تھے اور آمدنی کم ہونے لگی۔ تعلیم یا کوئی ہنر بجو کے پاس نہیں تھا۔ جسم بھی کمزور ہونے لگا تھا۔ ایک دن کسی کی مٹی میں وہ قبرستان گیا تو وہ گورکن کو پہچان گیا۔ وہ پُرانی جان پہچان والا نکل آیا۔ اُس دن تو رسمی سی گفتگو کی مگر اگلے ہی روز پھر ملاقات کی غرض سے پہنچ گیا۔ کچھ دیر میں اپنا مقصد بھی اُس کے سامنے رکھ دیا۔ مالی تنگی اور کسی کام سے واقف نہ ہونا۔ اگر قبر کھودنے کا کام بھی ملے گا تو میں کرلوں گا۔ گورکن نے اپنی منظوری دے دی اور اگلے دن سے بجو نے یہ کام بھی شروع کردیا۔ آمدنی میں جتنے پیسوں کی کمی پڑ رہی تھی، اس سے تھوڑے زیادہ ہی آنے لگے۔

ایک دن قبر کھود کر دونوں سُستانے کی غرض سے بیٹھے تھے۔ دوست نے بجو کے

لیے جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں دونوں بیڑیاں دبا کر ماچس سے سُلگائیں۔ ایک بیڑی بیجو کی طرف بڑھائی اور دوسری اپنے سیاہ اور پپڑی جمے ہونٹوں میں دبائی۔ وقفے وقفے سے کھانسی اور دھوئیں کے اخراج کے ساتھ کچھ کانا پھوسی چلتی رہی۔

خرم نے کئی بار بیجو سے قبرستان کے تجربے جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کسی سے سُن رکھا تھا کہ کسی مقام کے بارے میں کتابیں پڑھنا اور خود وہاں جا کر دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ اسی خیال نے بیجو کے سامنے یہ تجویز رکھنے کا جواز پیدا کیا۔ یہاں تو صبح وشام مختلف طرح کی لاشیں آتی ہیں۔ اُن کے تعلق سے یا رات کے مہیب سناٹے میں کسی قبر میں کوئی ایسی انوکھی بات یا واقعہ دیکھا ہو۔۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔بتائیں۔۔۔؟ بیجو نے خرم کو زیادہ غور سے دیکھا تھا۔ چند لمحے سوچنے میں گزارے پھر بڑے پُراسرار طریقے سے کہا کہ ''اس کے لیے موڈ بننا ضروری ہے۔'' وہ اس بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کہیں کچھ پینے پلانے والا مسئلہ تو نہیں۔ شبہ اس لیے تھا کہ بیجو کے تعلق سے اب تک اُسے یہ نہیں معلوم تھا ہر چند کہ ذہن اس بات کی تائید نہیں کر رہا تھا مگر اُسے یہ بھی تو معلوم تھا کہ کسی کو تبدیل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے اور کیا کچھ لگتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ کسی دن بیجو سے براہِ راست موڈ بننے والی بات دریافت کر لے گا۔ بیجو اگر ابھی وضاحت کر دیتا تو اس کا کیا جاتا۔ کتنا سوچ کر جواب دیا ہے۔ اسی لیے تو اس کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا۔ چھپا لینا، بتا دینے سے زیادہ پُراسرار اور معنی خیز کیوں ہے؟

''موت واقعی زندگی کا وقفہ ہے۔۔۔۔یا۔۔؟'' اپنے آپ سے یہ سوال کر کے وہ کچھ دیر تک جانے کیا سوچتا رہا۔ ''زندگی کا مقصد خالقِ کائنات کے احکامات کی تکمیل ہی ہے یا اور بھی۔۔۔۔کچھ۔۔۔؟'' جس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ صرف خوش فہمی یا مغالطہ۔۔۔۔اس سے زیادہ موت کے بارے میں جاننے کے لیے مرنا ضروری ہے شائد؟

وہ لوگ جو خدا کے منکر ہیں، کسی بھی مذہبی نظریے کو نہیں مانتے۔ اُن کے لیے نمایاں فرق زندگی جینے سے عبارت ہے۔ اُن کے یہاں موت کی منطق زبانی طور پر جو بھی ہو۔ تصدیق شدہ انجام تو ان کے یہاں بھی وہی ہے جو بیجوا نڈے والے کا ہے۔

اپنے علم یا زورِ بیان سے کسی کو مرعوب یا متاثر کرنا الگ بات ہے مگر ایک لفظ بھی زیادہ جان پانے کے اہل اب بھی نہیں ہیں ہم لوگ، اور یہی دائمی صداقت ہے۔ ردّ وقبول ہمارا اختیاری معاملہ ہے۔ نظریہ مثبت ہونے پر عقیدت بھی اپنا حق طلب کرنے آجاتی ہے۔ منکر کے لیے عالم ارواح کی صداقت کوئی معنی نہیں رکھتی مگر انکشاف کیے بغیر مرجانا تو اُس کا مقدر بھی ہے، اس کے باوجود سُرخرو ہونے یا سرفرازی کے لیے خود ساختہ کچھ معیار و آداب تو اُس نے بھی متعین کیے ہوئے ہیں۔

خدا کی نفی وجود کی داخلیت سے بھی تو انکار ہے۔ موت سے بہت زیادہ خوف زدہ ہونا یا اُس کے اسرار جاننے کا تجسس ہمارے اندر حوصلہ تو نہیں بھر دیتا۔ بہتر فہم و ادراک ہمیں احساسِ برتری کے ساتھ خوش فہمی میں رہنے کا عادی بنا دیتا ہے۔

خرم اپنے باطن سے خاصہ مذہبی انسان تھا۔ اللہ سے ڈرنے والا ہر چند کہ اب ڈر پہلے سے بہت کم ہو گیا ہے ورنہ بچپن میں تو وہ مدرسے کے حافظ جی یا اماں، ابا کی ہر بات کو صحیح مان لیتا تھا جس میں اصلاح کے لیے اُسے تنبیہ کی جاتی تھی۔ زندگی اور موت پر شریعت بنا کر اُسے ذہن نشیں کرایا گیا، وہی سب کچھ اُسے یاد تھا۔ عمر اور مطالعہ سے اُس نے اپنے نظریہ کے مطابق سب دُرست بھی کر لیا تھا۔ بعد از مرگ وہی سب کچھ ہونے والا ہے جو قرآن میں اللہ نے فرما دیا۔ جو ظاہر کر دیا وہی ظاہر ہوا جو نہیں کیا، وہ آج تک پوشیدہ ہے اور قیامت تک رہے گا بھی۔۔۔۔ ذہین اور مفکر آتے جاتے رہیں گے۔ اپنے ہر بندے سے اُس کے جو معاملات ہیں وہ کسی تیسرے کو نہیں معلوم؟ میری ہر نیکی اور بدی کو وہی جاننے والا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جب ہمارے لیے اطمینان اور بے اطمینانی کے لیے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ یہ اضطراب و بے چینی عارضی ہے، ہمیں تو یہ

علم بھی نہیں، مثبت آواز ہی اکثر اُس کا تعاقب کرتی ہیں یا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ موبائل کی گھنٹی سے اُس کی سوچ میں رخنہ پڑتا ہے۔ وہ بات کیے بغیر فون منقطع کر دیتا ہے۔ خلوت میں خیالوں کے جنگلات میں دور تک نکل جانا اور پھر بھٹکتے رہنا، اُس کی عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ شعروادب سے تھوڑا بہت شغف اُسے شہرِ ذات کے محاسبے کی صرف ترغیب ہی نہیں دیتا، معاون بھی بنتا ہے۔

پھرتی سے اُٹھ کر اُس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، تولیہ سے پانی کو جذب کیا۔ ایک ہاتھ میں شیشہ پکڑ کر دوسرے سے بال دُرست کیے جبکہ بیسن کے پاس ہی آئینہ لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ عجلت میں لگ رہا تھا۔ اماں چوکی پر بیٹھی اُس کی نقل و حرکت کو بغور دیکھ رہی تھیں اور اس بات کا ٹرم کو اندازہ تھا۔ اسی لیے شعوری طور پر اُس نے احتیاط برتا کہ جانے سے پہلے اماں سے آنکھیں نہ ہی ملیں تو بہتر ہے۔ اسی میں اس کے لیے عافیت بھی ہے۔

مئی کا ابھی آغاز ہی تھا مگر گرمی بہت شدید تھی۔ لوگ خاصے پریشان تھے بلکہ اُکتا گئے تھے۔ موسم کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ ہر بار یہی لگتا کہ اس بار سب سے زیادہ ہے، خواہ سردی ہو یا گرمی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اب قوتِ برداشت کم ہو گئی ہے ورنہ پہلے کے زمانے میں تو آسائش کے اتنے اسباب نہیں تھے پھر بھی اتنا واویلا نہیں تھا۔

محکمۂ موسمیات کے مطابق باہر کا درجۂ حرارت تو ہر کس و ناکس کو معلوم تھا مگر اُس کے اندر کے صحرا کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ زیادہ بجلی کٹوتی کی وجہ سے بھی دشواری بڑھ رہی تھی۔ نیند پوری نہ ہونے کے سبب رات میں لوگوں کا صبر جواب دے رہا تھا۔ سڑکوں پر نکل کر نعرے بازی اور شور شرابا بھی ہو رہا تھا۔ کثیر تعداد میں لوگ موبائل سے ویڈیو بنا رہے تھے۔

ذی علم حضرات موسم کی تبدیلی کو جغرافیائی تغیرات کا پیش خیمہ بتا رہے تھے۔ ایسے بھی خاصے لوگ تھے جن کے پاس Global Warming کے دلائل بھی تھے کہ

فلاں ملک کا ایک بڑا سرسبز و شاداب خطہ۔۔۔۔۔۔ ریگستان میں تبدیل ہو گیا ہے اور فلاں نہر اور جھیل۔۔۔۔۔۔ خشکی میں تبدیل ہو گئی۔ صحراؤں میں پیڑ پودے نکل رہے ہیں۔ برف باری ہو رہی ہے۔ چار لوگ کہیں بیٹھتے ہیں تو اختلاف رائے کے ساتھ ایسے موضوعات زیر بحث آتے ہیں مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ حالات سازگار نہیں ہیں اور یہ احساس انہیں خوف زدہ کرتا ہے۔ مسائل پہلے ہی کیا کم تھے جو اس نئی اُفتاد نے آ کر اُن کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ سب کی گتھیں، پیچیدگیاں الگ۔۔۔۔ سلجھانے کی جگت میں سرے کی تلاش میں بھٹکتی۔۔۔۔ حواس باختہ سی یہ نئی نسل بلکہ پوری قوم۔۔۔؟

شام کے چھ بج چکے تھے۔ خورشید کی جبیں پر اُبھری شکنیں کم ہونے لگی تھیں۔ وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اُسے نہیں معلوم کہ جانا کدھر ہے۔ وہ تو گھر سے غیر ارادی طور پر نکلتا ہے اور پھر کہیں نہ کہیں جانے کا خیال بھی آ جاتا ہے۔ جب تک منزل متعین نہیں ہوتی وہ ناک کی سیدھ میں چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرم ہوائیں اب بھی گال پر طمانچوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ پیدل چلنے کی وجہ سے خاصہ پسینہ نکل رہا تھا۔ ویسے بھی خرم کو پسینہ کچھ زیادہ ہی نکلتا ہے۔ قمیض کی آستین سے وہ بار بار یہ نمکین پانی خشک کر رہا تھا مگر پسینہ تھا کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔

ایک اور دن سیاحی کرنے کے لیے۔۔۔۔ ایک اور رائیگاں سفر کا بوجھ شانوں پر اُٹھائے کسی منزل کی تلاش میں جس کے خدوخال اس کے ذہن میں بھی کبھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ چہرے پر دائمی اُداسی کے ساتھ گھٹنوں میں درد کی چبھن اُسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی اور تبھی ایک بہت عالیشان کوٹھی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ معاً ٹھہر گیا۔ حالاں کہ یہاں آس پاس اور بھی مکانات ایسے تھے جو صرف آپ کی توجہ ہی نہیں کھینچتے، عش عش کرنے کے لیے بھی مجبور کرتے ہیں۔ قیمتی اور خوبصورت سامانوں سے مرصع و مزین۔ بہت مہنگے مکانوں میں رہنے والوں پر ناز نخرے یا تھوڑا بہت تکبر بھی

کھپ جاتا ہے۔

یہ کوٹھی جس کے سامنے خرم کے قدم اپنے آپ ہی جم سے گئے تھے، یہ بقیہ سے بھی منفرد اور زیادہ اچھی تھی۔ اپنے صانع کی فنکاری کا بیّن ثبوت۔ اگر آپ کے پاس پارکھی نظر ہے تو داد و تحسین صرف بام و در کی نہیں دینی ہوتی ہے۔ مکین کے مزاج اور شعور کا بھی کچھ سُراغ مل جاتا ہے۔ اتنی تھکن نے اور گرمی کے باوجود ایک گھر کی ندرت اتنی گرویدہ کیسے کرسکتی ہے۔ وہ تھوڑا اور اُداس ہوگیا۔ کس طرح کے لوگ رہتے ہیں ایسے مکانوں میں۔ اُن کے ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس جنتِ ارضی میں رہنے کے لیے الگ سے کوئی سند لینی ہوتی ہے۔۔۔ کیا۔۔۔ اور وہ کہاں سے دستیاب ہوتی ہے۔؟ خود کلامی کے سے انداز میں وہ مسلسل اُس قصر نما گھر کو یاس وحسرت سے تکے جارہا تھا۔

کیا اس میں رہنے والے اُس سے زیادہ حساس ہیں یا حق حلال کی فکر میں اُس پر سبقت لے جانے والے ہیں۔۔۔؟ کافی دیر تک وہ اپنے آپ ہی سے اُلجھا رہا۔ ایک ایسا شخص جو آسائش پہنچانے والی نعمتوں سے محروم ہو۔ ہر مرحلے میں اپنی قسمت کے سر ٹھیکرا پھوڑ کر کچھ دیر کے لیے خود کو مطمئن کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس طرح خوش ہونے کی ساعتیں بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، بے حساب دیتا ہے، اندر بیٹھا ہوا خوف اور یقین اس کی تائید کرتا ہے اور پھر وہ نظر عمارت سے ہٹ کر آسمان کی طرف چلی جاتی ہے۔ چند لمحوں پہلے جو مایوسی یا ناشکری کے ابر ذہن میں اُٹھے تھے، معاً مثبت ہوا کے تیز جھونکوں سے اُڑ جاتے ہیں۔ وہ نادم ہو جاتا ہے۔ اُس کا سر جھک جاتا ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے قدم اُٹھاتا ہے۔ روشنی ماند پڑنے لگی ہے۔

اُس نے آگے چلنا شروع کر دیا۔ بہت سارے سوالات اُس کا پیچھا کر رہے ہیں اور خرم یہ سوچتا ہوا جا رہا ہے کہ یہ سکھ، دکھ عارضی ہی سہی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کے پاس ضرورت بھر کے پیسے نہیں ہو پاتے ہیں۔ اس نے عیش و عشرت کی

زندگی کے خواب دیکھے بھی نہیں، بس حاجتیں پوری ہو جائیں، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر۔ وہ اس سچائی کو جھٹلا نہیں سکتا کہ وہ محرومی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تمام خسارے اُسی کا مقدر ہیں۔۔۔ سب زیاں اُسی کو چکانے ہیں۔ اسے وقت کا جبر نہ بھی مانیں تب بھی اُس کے ساتھ نہ چل پانے کا تاوان کوئی دوسرا تو ادا نہیں کرے گا۔

مدرسے کے ابتدائی دنوں میں مولوی صاحب نے یاد کرایا تھا کہ خالقِ کائنات کے ہر ذی روح سے ذاتی مراسم و معاملات ہیں۔ یہ عقدہ کسی تیسرے پر نہیں کھلتا۔ خرم کو بھی علم تھا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کیا کچھ ہے۔ اللہ اس کے بھی تمام خیر و شر سے واقف ہے مگر مجموعی طور پر وہ صورتِ حال بہت تشویشناک محسوس نہیں کرتا۔ اقرأ کے معنی سمجھنے کا اشتیاق و تجسس عطا کر کے اس نے بھرپائی کر ہی دی۔۔۔ اس کے اسرار وہی جانتا ہے مگر خود پر کچھ منکشف ہونے کا بھرم تو ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ روشنی کی لکیر جیسی ہے جو زیادہ تیرگی میں صرف راستہ ہی نہیں دکھاتی، حوصلہ بھی بخشتی ہے۔

شہرِ ذات کی سیاحت میں خرم ہر زاویے سے اپنا نفع و نقصان دیکھتا ہے۔ اگر کہیں فاتح کے امکان روشن ہوتے ہیں تو شکست بھی بہت دُور تو نہیں ہوتی۔ اس کا مزاج گھر کے دیگر افراد سے بالکل الگ ہے۔ بھائی بہنوں میں تو اختلاف رائے ہوتا ہی ہے مگر یہاں تو اماں سے ہی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو پائی تھی۔ والدہ کا مقام و مرتبہ، ان کے حقوق اس سے زیادہ گھر میں کس کو معلوم ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ادائیگی نہیں ہو پا رہی ہے۔ اُسے اس بات کی کڑھن ہے اور وہ اُدھیڑ بُن میں لگا بھی ہے۔ لیکن اُن کا احترام وہ بہر حال کر ہی رہا ہے۔ کیسی کیسی سناتی ہیں مگر کبھی اس نے پلٹ کر جواب نہیں دیا جبکہ یہ دونوں کو معلوم ہے کہ وہ قصوروار نہیں ہے۔ جواب نہ دینا تو ہمارے اختیار میں ہے مگر ان جملوں کی اذیت سے بھی بچ جائیں، تو یہ اختیار سے باہر ہے۔ اب تو یہ چلن بہت عام بھی ہے مگر حساس آدمی پر زبان کی ضرب زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

آئندہ تو شائد اس سے بھی زیادہ برا وقت آنے والا ہے کیوں کہ اچھے اور قلندر

صفت لوگ اُس نے دیکھے ہیں اور حال فی الحال ایسے لوگوں کی پیدائش کے امکان نظر نہیں آتے ۔ بچے ہی کتنے ہیں ۔ روانگی کا سلسلہ جاری ہے۔ ماموجیسے سادہ اور معصوم لوگ کتابوں میں ہی ملیں گے اور وہاں بھی لوگ پڑھنا نہیں چاہیں گے۔

ماموبرابر اُس کی ہمت افزائی کرتے رہتے کہ" وقت کسی کا ایک سا نہیں رہتا۔ اوپر والا تو اپنے نیک بندوں کی ہی آزمائش کرتا ہے۔" ایسی سبق آمیز باتیں وہ بچپن سے سنتا آیا ہے اور اب ہر بات کے وہ معنی بھی نہیں رہ گئے جو پہلے کبھی ہوا کرتے تھے۔ والدین کے علاوہ مولوی صاحب نے بھی آخرت کا اس قدر خوف اُس کے اندر بٹھا دیا تھا کہ لگتا تھا کہ شائد ہی وہ کبھی ہر اس کے اس دریا کو پار کر سکے گا۔ وقت کے ساتھ زندگی کی تعذیب اور سفاکیت اُس کے سامنے آرہی تھی۔ آدمی کو پڑھنے اور جاننے کی صلاحیت اگر نصیب ہو جائے تو بہت سی کتابوں کے علم سے قائم کی ہوئی خوش فہمی دھڑام سے اپنے اوپر ہی گرتی ہے۔

خرم کو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے بھی بڑے خواب نہیں دیکھے۔ اب تو بڑے خواب کے معنی بھی وہ نہیں رہے جو اُس کے بڑوں نے اُسے بتائے تھے۔۔۔۔۔۔آج کی نسل تو بڑا سا کاروبار یا موٹی تنخواہ والی آرام دہ ملازمت۔ تمام آسائشوں اور مادّی چیزوں سے بھرا ایک عمدہ گھر، ایک کماؤ اور خوبصورت بیوی، حسین نہ بھی ہو مگر مالی اعتبار سے مضبوط ہو۔ پیسوں سے ہٹ کر کچھ اور سوچنے کے بارے میں انہیں تکلف ہوتا ہے مگر تعیش کے عکس بھی کبھی اُس کے ذہن سے نہیں گزرے۔ کیا اُسے موقع نہیں ملا۔۔۔؟

طاہر پھوپھا نے اماں سے اُسے مانگا تھا۔ اُن کے یہاں اولاد نہیں تھی مگر پیسے کی ریل پیل بہت تھی۔ وہ اس طرح کی نزاکتیں سمجھنے بھی لگا تھا۔ بہن کی محبت میں اماں کی برف پگھل بھی گئی تھی۔ اس نے آگے آکر اعلانیہ طور پر منع کیا تھا۔ اماں سے اختلاف کی داغ بیل اسی دن پڑی تھی۔ ان کے رویئے شائد تبھی سے بدلنے شروع ہوئے تھے۔

بڑے ہونے کے بعد خواب اور ارمان صرف اتنا تھا کہ دال روٹی اپنی ہو جائے۔ وہ اپنی بے چارگی اور محتاجی کی زندگی سے نجات چاہتا تھا۔ تعلیم اور صلاحیت کے اعتبار سے ایک بہتر نوکری کا وہ حقدار تھا مگر کیا کیجئے کہ جب مقدر ہی کھوٹا نکلا یا کوشش میں کہاں کمی رہ گئی وہ کس سے دریافت کرے بہت۔ تھوڑے سے پیسوں کے لیے بڑی لمبی ڈیوٹیاں بھی کیں مگر کچھ بھلا نہ ہوا۔ ہر کسی سے اُمید لگا بیٹھتا۔ عیاری مزاج میں نہیں تھی اس لیے ہر کسی کی بات پر یقین کر لیتا حتیٰ کہ جھوٹ پر بھی تب تک اعتبار باقی رہتا جب تک وہ اوپر آ کر تیرنے نہیں لگتا۔

تین بھائیوں میں خرم سب سے چھوٹا تھا اُس کے بعد بہن خرد تھی۔۔۔ اُس میں اور خرد میں پندرہ برس کا فرق تھا۔ بچپن گزر گیا۔ سب بڑے ہو گئے۔ سکندر بھائی سب سے بڑے تھے۔ ان کی شادی ہو گئی۔ خرم سے وابستہ کچھ نئے مسائل سکندر کی شادی کی چادر میں لپٹے تھے۔ چادر جھڑی اور دشواریاں فرش پر گر پڑیں۔ چوتھی چالے کے بعد انجم کو گھر کا ماحول سمجھنے میں بہت وقت نہیں لگا۔ وہ معمولی گھر سے آئی تھی اور چوں کہ سکندر بھائی نے اپنی پسند کی شادی کی تھی تو یہ پہلے سے ہی پتہ تھا کہ ناز و نخرے زیادہ ہی ہوں گے۔

انجم نے بڑی ہوشیاری اور مشاقی سے اماں کا اعتبار حاصل کیا۔ اُسے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ اماں خرم سے کبیدہ خاطر رہتی ہیں اور بس اتنا کافی تھا۔۔۔ عورت کے دونوں ہی روپ ہوتے ہیں۔ اگر بنانے پر آجائے تو بادشاہ بھی بنا دیتی ہے اور بگاڑنے پر آجائے۔۔۔۔ تو کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی۔ اماں کی خفگی اُس کے لیے سوہانِ روح تھی مگر وہ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اُداسی اور بے رغبتی بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی ماں اپنے پیدا کیے ہوئے بچے کے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتی ہے؟ جو اُس کے ساتھ ہو رہا تھا مگر پھر بھی یقین کرنا مشکل تھا۔۔۔ اس کا طرزِ زندگی اپنے بھائیوں سے الگ تھا۔ وہ بن ٹھن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ کپڑوں سے دلچسپی اتنی ہی تھی کہ پہننا

ضروری ہے۔ اچھے اور لذیذ کھانوں کا شوق ضرور تھا مگر اس خواہش کو بھی دفن کر دیا تھا کہ کبھی حالات سدھرے تو خوش ذائقہ کھانوں کی حسرتیں پوری کرلے گا۔ ابھی تو زیادہ سے زیادہ دیر گھر سے باہر رہنا ہے کہ یہ دونوں کے لیے ہی عافیت کا سبب ہے۔

وہ فٹ پاتھ سے اُتر کر سڑک پر آیا۔ اُسی وقت ایک موٹر بائیک آگے چل رہے ایک آدمی کے بالکل برابر سے گزری۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی جس کی وجہ سے پیدل چلنے والا شخص ڈر گیا مگر اس کے باوجود وہ زور سے چلایا۔ ''ابے دیکھ کر نہیں چلتا۔۔۔۔ ابھی ٹکرا جاتا۔۔۔تو۔۔؟'' بائیک سوار نے زور سے بریک مارا اور موڑ کر واپس آیا۔ ہیلمٹ اُتار کر اُس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا اور اُس لڑکے کا بغور جائزہ لیا۔ ''ابھی ملا کر کان کے نیچے ایک دوں گا تو گھنٹہ گھر نظر آجائے گا۔ سڑک پر چل رہے ہو اور احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ٹکرا جاتا۔۔۔تو۔۔۔؟'' بائیک والا جسامت کے اعتبار سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس لیے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔ پیدل والے کو اس نزاکت کا بخوبی اندازہ تھا کہ اس آدمی سے بھڑنے کا مطلب خسارہ ہی ہے۔۔۔۔ وہ سنی ان سنی کر کے اپنے راستے نکل لیا۔ بائیک والے نے بھی گاڑی اسٹارٹ کی اور زیرِ لب کہا کہ شائد لکھنؤ کا تھا۔ بائیک پھر سے غائب ہوگئی۔ اب خرم کو بھی وہاں سے رخصت ہونا تھا۔ پاش علاقے کی حدود شروع ہونے سے پہلے ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ اس بستی میں سب سے نچلی ذات کے لوگ رہتے تھے۔ مالی اعتبار سے بھی یہ طبقہ بہت کمزور تھا۔ سماجی طور پر بھی اُن کی ضرورت دنگے فساد میں صاحب ثروت کی املاک کے تحفظ کے لیے پڑتی۔ یہ بات خرم کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ شہر کے اکثر اہم اور مہنگے علاقوں سے پہلے ان مفلوک الحال لوگوں کو شعوری طور پر بسایا جاتا ہے یا محض اتفاق ہے۔ مگر اتفاق بھی کتنے بار ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں مل پایا تھا۔

پلاسٹک اور ٹین کی چادروں کو تان کر اُس کے زیر سایہ رہنے والوں کی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ دو جون کی روٹی کے لیے یہ لوگ بھیک بھی مانگ لیتے اور جرائم بھی کرتے۔

ایسے مقامات سے گزرتے ہوئے غریب غربا اور اُن کے کالے پیلے ننگ دھڑنگ بچے، ہاتھوں میں المونیم کے کٹورے تھامے بہتی ہوئی ناک کی آلائشیں منہ میں زبان سے گھسیٹتے دیکھ کر بھی خرم کو کراہیت نہیں ہوتی۔ وہ مزید افسردہ ہو جاتا ہے یہاں جابجا سور باڑے بھی ہیں۔ وافر تعداد میں نالی یا کوڑے کے ڈھیروں پر دکھائی بھی دیتے ہیں۔ اس جانور کے تصور سے ہی اُسے گھن آتی تھی۔ نظر پڑتے ہی وہ ہٹا لیتا ہے مگر اس کی ہیبت تمام تر غلاظت کے ساتھ ذہن پر دیر تک طاری رہتی۔ اس کی صرف اتنی خواہش ہوتی کہ سڑک عبور کرنے تک اسے ایک بھی خنزیر دکھائی نہ دے مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی۔ خرم ابھی بستی سے نکل نہیں پایا تھا کہ کچھ فاصلے پر اُسے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ تجسس بڑھا کہ آخر کیا معاملہ ہے؟ اُس نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ قریب پہنچنے کے بعد بھیڑ میں سے جھانکنے بھر کی جگہ بنالی۔ ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا جو غالباً اسی بستی کا تھا، زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ س کی قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور دائیں طرف سے کالر کے نیچے سے پھٹ بھی گئی تھی۔ بال کے ساتھ حواس بھی بکھرے ہوئے تھے۔ وہ خوف زدہ بھی تھا۔ اب یہ اشتیاق کہ کس نے اور کیوں مارا ہے۔ کسی سے سوال کیے بغیر اُسے جواب مل رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک عورت، عمر اور حلیہ کے اعتبار سے اس کی ماں لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی پکڑے تھی۔ خرم کو خاصہ تعجب ہوا۔ عورت نے مردانہ گالیاں بکنی شروع کیں۔ ''کیا وجہ ہو سکتی ہے اس عتاب کی''۔؟ اُس نے خود ہی سوچا شاید چوری چکاری کی ہو۔ اپنے آپ کو جواب بھی دیا مگر جواب اطمینان بخش نہیں تھا۔ آخر پاس کھڑے ایک شخص سے اُس نے دریافت کیا۔۔

''بھائی۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ کیوں مارا ہے اور یہ عورت کون ہے؟''

''اس کی ماں ہے۔۔۔ کھڑی تو ہے سامنے۔'' کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

''پٹائی کس لیے کی۔۔۔ ہے''؟ خرم نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار اُس آدمی نے خرم کو زیادہ غور سے دیکھا۔

''یہ کس کو نہیں معلوم ہے۔اس کا تو یہ روز کا ہے۔آپ شاید یہاں نہیں رہتے''۔

''آپ نے سہی پہچانا۔میں یہاں نہیں رہتا مگر اسے مارا کیوں ہے؟اس بار خرم کے لہجے میں ہلکی سی جھنجھلاہٹ بھی در آئی تھی۔

''کئی دن سے کام پر نہیں جا رہا ہے۔طبیعت کا بہانہ کر کے دن بھر موبائل میں لگا رہتا ہے۔'' توجیہ سن کر خرم کی تھرتھری سی چھوٹ گئی۔شریانوں میں بہتا ہوا خون جمتا ہوا سا محسوس ہوا۔

''یہ اس بچے کی سگی ماں ہے۔؟'' اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے خرم بولا۔یہ سوال سن کر استعجاب اُس آدمی کی طرف منتقل ہو گیا۔

''کسی کو مارنے کا اب ادھیکار ہی کہاں ہے۔'' وہ فلسفی بننے کی کوشش کرنے لگا۔

خرم سوچ رہا تھا کہ ایک ماں اپنے بیٹے کو جو ابھی نابالغ بھی ہے، کام نہ کرنے کی وجہ سے وہ اس بُری طرح سے مار بھی سکتی ہے۔آنکھوں کے سامنے کچھ دھندلکا سا طاری ہونے لگا۔شائد شام کی سیاہی گہری ہونے لگی تھی۔

''مجھے پیسے چاہیے۔۔۔چاہیں جہاں سے لاؤ۔۔۔ورنہ اب مفت کی روٹیاں توڑنے کو نہیں ملیں گی۔۔۔'' یہ کس کی آواز تھی جو خرم کا تعاقب کر رہی تھی۔یہ لڑکا جو سڑک پر بیٹھا رو رہا ہے اور وہ عورت جو ڈنڈا لیے اُس کے پاس کھڑی ہے، یہ دونوں اُس سے اور اُس کی ماں سے کتنے مختلف ہیں۔اُس نے بھیڑ پر ایک سرسری نظر ڈالی۔اتنے مصروف لوگوں کے پاس تماشائی بننے کے لیے اتنا سارا وقت کہاں سے آجاتا ہے؟ہر اچھے،بُرے حادثے کی موبائل سے ویڈیو بنانا اور سوشل میڈیا پر اپ لوڈ (Upload) کر دینا۔اس نسل کی اتنی ہی ذمہ داری بچی ہے۔اُسے تعجب کے ساتھ افسوس بھی تھا کہ اتنے مجمع میں کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ آگے بڑھ کر کوئی اس بچے کو پٹنے سے روک لیتا۔

بھیڑ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تماشہ ختم ہوا۔اسی کے ساتھ لوگ تتر بتر ہونے لگے۔لڑکے کی ماں بھی ڈنڈے کے ساتھ گھر کی طرف مڑ گئی۔خرم اُس لڑکے کے قریب آیا۔

اُسے معلوم تھا کہ وہ اُس کے لیے زیادہ کچھ نہیں کر سکے گا مگر اُسے یہ یقین بھی تھا کہ اظہار ہمدردی تو وہ کر ہی سکتا ہے اور اُس سے اُس کی دلجوئی بھی ہو جائے گی۔ دو میٹھے بول زہر کا تریاق ہوتے ہیں۔ مگر لوگ پھر بھی گریز کرتے ہیں۔ لڑکے کی ماں دروازے پر ٹھہر کر دیکھ رہی تھی کہ یہ کون اجنبی ہے اور اُس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ خرم نے سہارا دے کر اُسے اُٹھایا۔ لڑکے کی ماں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی بھلا انسان ہی ہے جو اُس کی مدد کے لیے آگے آیا ہے۔ وہ یہ چاہ بھی رہی تھی کہ کوئی خیر خواہی کے لیے آگے آئے کنارے ہینڈ پائپ پر لے جا کر اُس نے لڑکے کا منہ دھلوایا۔ کچھ فاصلے پر ایک دواخانہ سے حال احوال بتا کر دوا لی اور اُس لڑکے کے حوالے کر دی۔ کچھ پیسے بھی دیئے۔ اُس کی خوشی بتا رہی تھی کہ اُس کا درد غائب ہو گیا، شاید اب دوا کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ خرم نے لڑکے کے سر پر دست شفقت رکھا اور رخصت مانگی۔ ایک عجیب سی چمک بچے کی آنکھوں میں تھی۔ یہ محبت و اُخوت کا وہ لاشعوری جذبہ تھا جو صرف بنی نوع آدم سے عبارت ہے۔ روزِ ازل سے قائم ہے اور آخری دن بھی باقی رہے گا۔

لڑکے کو گھر بھیج کر خرم نے اپنی راہ لی۔ اب وہ اور زیادہ تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ متعفن علاقے کو عبور کرتے وہ صاف ستھری چوڑی سڑک پر آ گیا، جہاں دونوں طرف شان و شوکت کی نمائندگی کرتے شاندار مکانات، علاقے کی رونق کے ساتھ قدر و قیمت میں بھی اضافہ کر رہے تھے۔ یہ ایک دوسری دُنیا تھی۔ دوری کے اعتبار سے چند قدموں کا ہی فاصلہ ہے مگر یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ خنک اور نرم ہوا جانے کیوں کر چلنے لگی تھی، معاً گرمی کا احساس کم ہونے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کہیں آس پاس بارش ہوئی ہے۔ منزل اور راستوں سے بے خبر وہ آگے چلتا ہی رہا۔ خیال آیا کہ ندی کنارے بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا جائے۔ وہ تھک بھی گیا تھا۔ ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا اور تبھی بادلوں کے گرجنے کی آواز اُسے سنائی دی تھی۔ بادلوں کو دیکھ کر بارش کے متعلق کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا

مانتا تھا، اسی غرض سے اُس نے اوپر نگاہ کی۔۔۔ گرمی سے عاجز ایک شخص کی تمنا بارش کے روپ میں گوریا کی طرح پھدک کر باہر آ گئی۔ کم سے کم خارجی گرد و غبار اور کثافت سے تو نجات مل ہی جائے گی۔۔۔ خواہ ایک دو دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔۔؟

خرم کا تقریباً یہ روز کا معمول ہے۔ گرمی کے موسم میں وہ شام ہونے سے تھوڑی دیر پہلے گھر چھوڑ دیتا ہے جبکہ سردیوں میں تمام دن باہر ہی رہتا اور مغرب کے بعد ہی گھر کے اندر آتا۔

ندی اُس کے گھر سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر تھی اور لُو، دھوپ کے موسم میں شام کو اندھیرا چھانے کے بعد بھی وقت گزارنے کے لیے یہ سب سے بہتر جگہ تھی۔ برسوں کا ایک تعلق ہے۔ بے شمار یادیں وابستہ ہیں یہاں سے۔ شہر کے شور شرابے اور گہما گہمی سے دُور یہ پُرسکون جگہ، اُس کے اندر برپا انتشار کی یکجائی میں بہت کام آتی ہے۔ سبزہ اور بہتا دریا، ذہن میں کوئی استعارہ یا علامت نہ بھی بنائے تو حواس پر اُس کے مثبت اثرات تو پڑتے ہی ہیں۔

سخت سردیوں کی بارشیں یا مہاوٹیں تو اذیت دیتی ہیں مگر گرمی کی بارش یا موسم کی بارش کا لطف ہی اور ہے۔ بہت سے لوگ تو بیمار ہو جانے کے خوف سے کبھی نہانے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ کچھ لوگ بھیگ جانے کو ہی سیرابی مانتے ہیں۔ ہم اپنی تشنگی سے ہی کتنا واقف ہیں۔ جس قدر بھرم قائم ہے، اُسی حساب سے سرشاری اخذ کر لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ صبح شام اس طرح کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہمارے اندر حرارت بھرتی ہیں۔ مثبت سوچ اور کسی طرح معاون نہ ہو مگر مسئلے سے لڑنے کا حوصلہ تو دے ہی دیتی ہے۔

بارش خرم کی کمزوری رہی ہے۔ پانی گرے تو وہ خود کو نہیں روک پاتا۔ گھر پر ہوتا ہے تو بھی چھت پر نکل جاتا ہے اور جب تک کپ کپی نہ آ جائے، باز نہیں آتا ہے۔ ایک پلاسٹک کا کور اُس کی جیب میں ہمیشہ رہتا تھا۔ کون جانے کب، کہاں بوندا باندی شروع ہو

جائے۔ کم سے کم اس پنّی سے بھیگنے والی چیزوں کو موبائل سمیت بچایا جا سکتا ہے۔ آج گرمی اور اُمس سے وہ کچھ زیادہ ہی اُکتا گیا تھا اس لیے یہ بارش کچھ زیادہ ہی مسحور کر رہی تھی۔ وہ اس طرح خوش ہوا تھا جیسے جنگل کا راستہ ختم ہو گیا ہو اور کسی بھٹکے ہوئے آدمی کو مضافات دکھائی دینے لگا ہو۔ کبھی تو بارش کا یہ نمکین پانی اندر کی ویرانی اور اُداسی تک دھوڑ لاتا ہے۔

یہاں بھی جو لوگ بھیگنے سے بچنا چاہتے تھے، کسی سائے یہ چھپّر کی تلاش میں ادھر اُدھر لپکے۔ اچانک پانی تیز ہو گیا۔ وہ پہلے ہی تر بتر ہو چکا تھا آج اتفاق سے اُس کا فون گھر پر چھوٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس بات کے لیے فکر مند تھا اب اُسے لگا کہ بہتر ہی ہوا۔ اُسے یاد بھی بہت دیر میں آیا ورنہ وہ راستہ سے پلٹ بھی سکتا تھا۔ گھر پر اُس کا فون اکثر سائیلنٹ پر ہی رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بارش تھم گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ ذرا دیر میں کپڑے سُوکھ جائیں گے۔ طبیعت میں تھوڑی سرشاری آ گئی تھی تو ندی کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔ پیدل چلنے کی عادت کے علاوہ وقت کی فراوانی بھی تھی۔ اب گھاٹ کے آس پاس خاصی روشنی کا اہتمام کر دیا گیا تھا ورنہ چند برس پہلے تو یہاں گھپ اندھیرا اور جانوروں کی آوازیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ یہاں آنے میں ڈر لگتا تھا۔

اوائل عمری میں وہ دوستوں کے ہمراہ بہت سالوں تک یہاں آتا رہا ہے گرمی کی چھٹیوں میں دوپہر بھر ندی کنارے ڈیرا ڈالے رہتے تھے۔ خرم کو تیراکی کا شوق تھا۔ اُس نے یہیں پر تیرنا بھی سیکھا تھا۔ اُس کے کئی دوست پہلے سے تیراکی میں ماہر تھے اور اُن لوگوں نے ہی مشورہ کے ساتھ خرم کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ پھر جلد ہی وہ بھی مشاق ہو گیا تھا۔ پاس میں کچھ ٹیلے تھے۔ یہ سب لوگ اُس پر چڑھ کر پانی میں جست لگاتے اور اپنی خود اعتمادی کے حساب سے زیرِ آب ٹھہرے رہتے۔ اُن چھلانگوں کا بھی کیا لطف ہوا کرتا تھا۔

اب کئی ٹیلے اور چبوترے غائب ہو گئے تھے۔ اطراف میں گندگی بھی بڑھ رہی تھی۔ سرسیّہ گھاٹ جو یہاں سے خاصہ دور تھا، جہاں اہلِ ہنود اپنے مُردوں کا داہ سنکار کرتے

تھے۔اب اکثر مُردے یہاں تک تیرتے ہوئے آجاتے تھے۔شروع میں اُسے تعجب ہوا تھا کہ نذرِآتش کے بعد جب خاک بچتی ہے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مُردے کی ہے۔۔۔؟وقت کے ساتھ ندی کے آس پاس کا منظر ہی نہیں پس منظر بھی تبدیل ہورہا تھا۔خرم کے ذہن میں ندی کا پھیلاؤ۔۔۔۔تیز بہاؤ اور بارش کے دنوں میں کٹان کا سلسلہ اور اُس کے بعد پانی کا مسلسل کم ہونا۔۔۔سمٹتا۔۔۔سکڑتا ہوا رقبہ اور آباد ہوتی ہوئی بستیاں۔یہاں سکون سے بیٹھو تو کیا کچھ یاد آتا ہے۔؟

راستے میں کثیر تعداد میں امرود کے باغات تھے۔جس باغ میں چوری کے خطرات کم ہوتے وہاں پورے گروہ کا حملہ ہوتا۔کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ امرودوں کو درخت سے آزاد کروانا اُن کا مقصد ہوتا۔۔۔۔نہانے کے بعد ان امرودوں کو کھانے کی لذت بیان کرنے سے وہ خود کو قاصر پاتے۔

وہ ماضی سے حال میں لوٹا۔ایک اچٹتی سی نگاہ ندی کے پانی پر ٹھہر گئی۔پانی کم ہو جانے کے سبب بہاؤ بھی اب اُتنا تیز نہیں تھا۔پانی کا یوں مرنا۔۔۔۔کیا کیا خسارے پیدا کرسکتا ہے۔وہ یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔کچھ سرگوشیاں اُسے سنائی دے رہی تھیں۔۔۔کچھ اشارے اُسے یاد آرہے تھے۔دور تک تیرگی اور ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں۔۔۔نہ پانی کے قل۔۔۔۔قل۔۔۔۔کی آواز۔۔۔۔نہ پرندوں کا شور۔۔۔۔ ایک گم صم اُداس سی۔۔۔ویرانی۔۔۔سناٹا۔۔۔اندھیرا۔۔۔بڑھتا ہوا۔۔۔کوڑے اور لاشوں کی بدبو کے ساتھ گھر واپسی کے لیے اُس کے قدم۔۔۔؟"

●●●

آہنی پھاٹک کھول کر اپنے خاص انداز میں اُس نے زور سے بند کیا۔ گھوم کر برابر والے مکان کے دروازے پر نظر ڈالی۔ وہاں بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ یعنی وہ لوگ گھر پر موجود نہیں ہیں۔

خرم کے پڑوس کا یہ مکان اُس کے لیے صرف بام و در یا فصیل بھر نہیں ہے۔ اس گھر میں تین افراد رہتے ہیں۔ انترا اور اُس کے والدین۔ وہ گھر میں ہوتی تو یقیناً گیٹ کی آواز سن کر کہیں نہ کہیں سے گردن نکال کر اپنی صورت دکھا ہی دیتی۔ یہ رشتہ اور تعلق اور ہی طرح کا تھا۔ دیر رات واپس آنے پر انترا کو دیکھنا اس لیے زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ اندر گھستے ہی اماں کی کھری کھوٹی سننے اور اُف نہ کرنے کی ہمت اُسے وہیں سے ملتی ہے۔ کنڈی میں لٹکا ہوا قفل اُسے اچھا تو نہیں لگا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ابھی چند لمحوں بعد بھابھی کے سیاسی حربے اور اماں کی بے نقط سننے کے لیے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ یہ اُس کے لیے دائمی عفریت جیسا تھا۔ مایوس کن بات یہ تھی کہ فی الحال اس سے دفاع کے امکان بھی نہیں تھے۔ اپنے چہرے پر طاری اضمحلال وہ کھرچ کر پھینک دینا چاہتا تھا مگر ایسا کرنے میں وہ ہنوز ناکام تھا۔ اُس کے پاس زندہ رہنے کا جواز یا تمام زندگی کا اثاثہ اگر کچھ تھا تو وہ انترا کی محبت تھی، جس کے خیال بھر سے اُس کی زیست کے صحرا میں سبزے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اماں کا زہر بجھا تیر جیسا جملہ اُس کے کانوں میں پڑا۔ ''آ گئے ـــــــ میرے کمائشد لال ـــــ کتنی کمائی کر کے لایا ہے۔؟'' بھابھی زیر لب مسکرائی تھیں۔ احتیاط برتنے کے باوجود اُس نے دیکھ لیا تھا۔ سکندر بھائی اور خرد بھی آس پاس موجود تھے مگر ان لوگوں نے کسی طرح کا ردِ عمل پیش نہیں کیا۔ خرد تو اُس کی چھوٹی بہن ہے۔ اُس سے خرم کو کوئی شکایت بھی نہیں بلکہ وہ اکیلے میں اماں کو ٹوکتی بھی تھی۔ اس کی اپنی مجبوریاں تھیں مگر وہ خرم کا خیال رکھتی تھی۔ کئی بار تو وہ شرمندہ بھی ہو جاتا۔ ماں کے کوسنے جاری رہتے۔ وہ وہیں پاس کھڑا ہو جاتا تھا کہ اماں کو زیادہ چیخنا نہ

پڑے۔ یہ سب آئے دن کا تھا مگر اماں کی باتیں اُسے بہت اذیت پہنچاتی تھیں۔ دیر رات تک آوازوں کی بازگشت اس کی سماعت میں گونجتی رہتی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی وہ اس تخاطب اور لہجے کا عادی نہیں ہو پایا تھا۔

خرم شروع سے ہی بہت خاموش طبیعت کا تھا۔ کم بولنے والا۔ ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ آدمی کو سمجھنے کے بعد ہی مراسم کی نوعیت طے ہوتی۔ تربیت سے متعلق بہت سی چیزیں کسی کو سکھانی، بتانی نہیں پڑتیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی سے پہلے سے وہ زبان کی حُرمت سے واقف تھا۔ اماں دوسروں کو بتاتی تھیں کہ جب سے بولنا شروع کیا ہے، تبھی سے اتنا کم گو ہے۔ اماں اتنا کب سے بولنے لگی ہیں، یہ البتہ اُسے نہیں معلوم تھا۔ مقابلے پر ماں تھی۔ اُس کے حق و مرتبے سے وہ واقف تھا اور اس کوشش میں بھی تھا کہ جلد ان کی شکایتیں دور کردے۔ اماں کی شان میں گستاخی تو کجا وہ کبھی زبان پر حرفِ شکایت بھی نہیں لاتا۔

خرم آہستہ سے اماں کی چوکی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اماں کی بھڑاس بھی تقریباً نکل گئی تھی۔ سکندر بھائی اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ پیچھے سے انجم بھی کھسک گئی۔ خرم کا معمول تھا کہ صبح، شام وہ اماں کے پاس کچھ دیر بیٹھتا ضرور تھا۔ اماں کتنی ہی خفا کیوں نہ ہوں۔ اُسے پھٹکار رہی ہوں یا بات بھی نہ کر رہی ہوں مگر تب بھی اُسے بیٹھنا ہی تھا۔

اماں کھڑکی کے پاس چوکی پر مستقل بچھی جائے نماز پر بیٹھی ہوتیں اور وہ اُن کے سامنے کبھی اسٹول پر ۔۔۔۔ کبھی ۔۔۔۔ چٹائی پر یا چوکی پر جگہ ہوتی تو وہیں بیٹھ جاتا۔ رات میں تو اکثر ایسا ہوتا کہ بقیہ لوگ اپنے کمروں میں ہوتے اماں ذکر و اذکار یا تسبیحات میں مصروف ہوتیں۔ اماں کے پیچھے والی دیوار پر اُن کے جہیز کی وہ پرانی پنڈولم گھڑی لگی ہوئی تھی۔ انجم نے اس گھڑی کو ہٹانے کی بہت کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ اماں کی آنکھ کی کرکری نہیں بننا چاہتی تھی ورنہ ہٹا تو وہ اماں کو بھی دیتی۔ وہ سب

کچھ اپنے طریقے سے صبر و تحمل کے ساتھ کر رہی تھی۔

کثر کوئی نہ کوئی گھڑی کا ذکر چھیڑ دیتا پھر اماں دیر تک گھڑی سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتیں۔ آخر میں یہ ضرور بتاتیں کہ "اپنے حصے کی دیوار پر ٹانگی ہے۔ کسی کے کلیجہ میں درد نہ ہو۔"

آخر کار اماں خاموش ہو گئیں۔ خرم کی نظر اُسی گھڑی پر اٹکی تھی جس نے اس کی ساری گھڑیاں دیکھیں ہیں۔ ایسے موقعوں پر اُسے کیا کہنا چاہئے، اُسے نہیں معلوم تھا۔ وہ اتنے غور اور انہماک سے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہا تھا کہ ان کی لرزش بھی اُس نے محسوس کی۔ معاً یہ کھیل سا کچھ لگنے لگا۔ اُس کی توجہ تیسری یعنی سکنڈ والی سوئی کی طرف گئی۔ کیا اس کی اہمیت بڑی سوئیوں سے کم ہے؟ ایک یوں ہی سا سوال اُس کے ذہن میں آیا۔ اہمیت تو برابر ہے مگر چھوٹے ہونے کے اپنے خسارے تو ہیں ہی۔ وہ کہیں کسی بھی اعتبار سے ہو۔ اُس کے بغیر ان دونوں بڑی سوئیوں کے چکر کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ خرم نے اپنا دھیان گھڑی کی طرف سے ہٹایا۔ اب کہیں جا کر اماں سے اُس کی نظریں ملیں۔ ماں سے زیادہ اولاد کا کرب اور کون جانتا ہے۔ اُن کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے تھے۔ اُس نے دیکھا ہمیشہ کی طرح جائے نماز کا ایک کونا داہنی طرف سے ابھی بھی مُڑا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ہم اپنے منفی رویّوں اور عادتوں کے کس قدر تابع بلکہ غلام ہوتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پہلی بار جب اُس نے یہ مڑا ہوا کونا دیکھا تھا تو بڑی معصومیت سے اماں سے دریافت کیا تھا۔

"اماں۔۔۔۔ یہ کیوں۔۔۔۔ موڑا۔۔۔۔ ہے"۔۔۔؟

"تو مڑ ہو گیا ہے مگر تجھے ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ جائے نماز کا کونا کیوں موڑا جاتا ہے۔"

"پہلی بار میں تو کوئی کسی سے پوچھتا ہی ہے اماں۔ دیکھا تو میں نے اور لوگوں کو بھی ہے، ایسا کرتے ہوئے مگر اُن سب سے تو نہیں کہہ سکتا تھا۔" شائد اماں اُس کی

تاویل سے مطمئن ہوگئی تھیں، تبھی انھوں نے جواب بھی دیا تھا۔ ''یہ اس لیے موڑتے ہیں تاکہ شیطان نماز نہ پڑھنے لگے۔ یہ ہمارے بزرگوں کا ٹوٹکا ہے۔ میں اپنے گھر میں بھی بچپن سے دیکھتی آئی ہوں۔ اگر جلد بازی یا لاپرواہی میں موڑنا بھول جائیں تو شیطان کا مصلے پر کھڑا ہونا یقینی ہے۔'' وہ اماں کو حیرت و استعجاب سے دیکھے جا رہا تھا بلکہ آنکھیں کچھ زیادہ ہی پھیل گئیں تھیں۔ اُس وقت آج سے بہتر سمجھ نہیں تھی اس میں۔

''مولی صاحب (مولوی صاحب) تو کہتے ہیں کہ یہ کام تو شیطان کا ہے۔؟''

''کون۔۔۔سا۔۔۔کام۔۔۔؟'' اس بار اماں کے چونکنے کی باری تھی۔

'نیک اور اچھے کاموں سے بندے کو روکنے کا کام۔'' خرم نے خود اعتمادی سے جواب دیا تھا۔ اماں کی تیوریاں ایک دم چڑھ گئیں تھیں۔ خفگی کے آثار پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود خرم پھر سے گویا ہوا۔

''شیطان کا کام ہمیں نماز سے روکنا ہے۔ وہ ہم کو ورغلا کر خود کیوں نماز پڑھتا ہے اور اگر اسے سچ مان بھی لیں تو اماں، ہم کون ہوتے ہیں اُسے روکنے والے۔۔۔ خرم کی منطق سے وہ تذبذب میں پڑ گئیں تھیں مگر یہ بات تسلیم کرنا ان کے لیے شائد ہتک آمیز تھا۔ وہ پھر سے گویا تو ہوئیں مگر اس بار آواز زیادہ کرخت نہیں تھی۔

''یہ سب پڑھاتے ہیں مولوی صاحب تجھے''۔۔۔ آنے دے ابا کو تیرے ۔۔۔ ہوش ٹھکانے لگواتی ہوں، تیرے بھی اور اس نگوڑے مولوی کے۔۔۔ بھی۔''

اُس دن پہلی بار اماں نے شک کی نظر سے خرم کو دیکھا تھا۔ اُس نے اماں سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ اماں کی اُنگلیوں کے پوروں میں دبے تسبیح کے دانے سنبھلنے کی کوششوں کے باوجود گر پڑ رہے تھے۔ خرم کو لگا کہ اب یہاں سے اُٹھ جانے میں ہی بھلائی ہے۔ اُس نے اُٹھنے سے پہلے دالان کی طرف دیکھا۔ ابا کی بیشتر کھڑی رہنے والی کھٹیا، اس وقت بچھی ہوئی تھی اور اس پر ابا سوئے ہوئے تھے۔ عشاء بعد اُن کے لیے جاگنا مشکل ہو جاتا۔ تہجد میں اُٹھنے کا معمول بھی تھا اُن کا۔ خرو کے ذہن میں جو کچھ چل

رہا تھا، خرم کو اُس کا اندازہ تھا۔ اُس کا یہ وقت ٹی وی پر سیریل دیکھنے کا تھا۔ وہ بھائی کو کھانا لاکر کھلانا چاہتی تھی مگر اُس کے لیے اماں کی جبیں پر اُبھری شکنیں غائب ہونے تک انتظار کرنا تھا مگر خرم کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابا کے خراٹوں کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ رات بھر گھر کا یہ حصہ کسی ہوٹل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سکندر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کمرے میں گھستا ہے تو پھر کسی خاص وجہ کے بغیر صبح سے پہلے باہر نہیں آتا۔ نیم تاریکی کے ساتھ پسرا ہوا سناٹا۔ خرد اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اپنے وظائف سے فارغ ہو کر اماں بھی سونے کی تیاری کرتیں۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے سوچتا ہے کہ یہ گھر ہمیشہ سے تو ایسا نہیں تھا۔ کیوں ایسا ہو گیا ہے۔۔۔۔ کیا صرف اُس کی وجہ سے؟ وہ باورچی خانہ کی طرف بڑھتا ہے۔ اماں کی آواز اُس کے کانوں میں پڑتی ہے۔

"خرد کو بلا دوں۔۔۔۔ وہ کھانا نکال دے گی۔" وہ رُک کر اماں کی طرف دیکھتا ہے۔ اب اُن کے چہرے پر اپنی اولاد کے لیے صرف شفقت باقی تھی۔ اُس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔۔۔۔ "نہیں اُسے نہ بلائیں، میں خود ہی کھا لوں گا۔۔۔۔" کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ پہلے بیسین پر جا کر ہاتھ، منھ دھویا اور پھر اُس کے بعد کچن میں آ گیا، بھوک تو بہت زور کی لگی تھی۔ جلدی سے کوکر کھولا۔ اُس میں ایک پھلکی کے ساتھ تھوڑی سی کڑھی نظر آئی۔ روٹی کی ڈلیہ میں کپڑے میں لپٹی دو روٹیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اُس کی خوراک بھی دو ہی روٹیوں کی تھی۔ پھلکی نہ بھی ہوتی تو اتنی کڑھی تھی کہ دونوں روٹیاں سُوارت ہو جائیں گی۔ حالاں کہ خرم کو بیسن کی پکوڑیاں کچھ زیادہ ہی پسند تھیں۔ کڑھی میں پڑ جانے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ باورچی خانہ جب تک اماں کی دسترس میں تھا تو وہ برابر اُس کی اس خواہش کا لحاظ رکھتیں۔ کڑھی پکاتیں، تب بھی الگ سے تھوڑی پیاز بیسن میں ملا کر اُس کے لیے پکوڑیاں تل دیتیں۔ اُس کی نظر سنک کے پاس رکھے ڈسٹ بن پر پڑی۔ شہر کے ایک نامی گرامی ہوٹل کے کھانے کی پیکنگ دکھائی دی۔ اس میں تکلیف دہ صرف وہ شعوری کوشش تھی کہ اُسے اس کی اطلاع کیسے کی جائے۔ یہ سب اُس کے ساتھ کافی

دنوں سے ہو رہا ہے۔ شروع میں یقین کرنا مشکل تھا۔ اب اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی۔ صبر زیادہ آ گیا ہے۔ دوسرے کوکر میں دن کے بچے ہوئے تھوڑے سے چاول بھی تھے۔ چاول تھوڑے سے لگ گئے تھے۔ شائد اسی لیے بچ گئے تھے۔ بہر حال اُس نے وہ کھالیا اور برتن بھی دھو کر رکھ دیا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر آدھی سے زیادہ خالی کر دی۔ زیادہ پانی پینے کی وجہ سے جلے ہوئے چاولوں کی مہک اور گہرے کتھئی رنگ کے نشان کے ساتھ اُس آگ کو بھی ٹھنڈا کرنا تھا جو رشتوں کو بھسم کر کے اُس کی خاک اُڑانا چاہتی تھی۔ وہ کچن سے باہر آیا۔ اماں سونے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ خرم کی آہٹ ملی تو اُس کی طرف گردن گھمائی۔۔۔۔ ''کھانا کم تو نہیں تھا۔۔۔ پیٹ بھر گیا۔ مرغا تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔۔۔ اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ خرد کو بلا دوں'' وہ اماں سے کیا کہتا۔۔۔

''ہاں۔۔۔ بھر گیا۔۔ پیٹ۔۔'' کچھ رُک رُک کر بولا تھا وہ۔

''مُرغے کا کچھ نہیں بتایا تُو نے۔۔۔ کیا۔۔ ٹھنڈا ہی۔۔'' ''مرغ نہیں بچا اماں۔۔۔'' یہ خرد کی آواز تھی وہ کسی کام سے باہر آئی تھی اور اُس نے اماں کا سوال سن لیا تھا

''ایں۔۔۔ نہیں بچا۔۔'' انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تو نے کیوں نہیں بتایا۔۔۔'' وہ خرم سے مخاطب تھیں۔

''اماں۔۔۔ اب۔۔۔ سو جائیں۔۔۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔'' ہر چند کہ وہ ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا مگر یہاں بھی اُس کے صبر نے اُسے سرخرد رکھا۔ گلے شکوے والا مزاج ہوتا تو اتنی دُرگت نہ ہوتی، ہر کس و ناکس اُسے پامال کر رہا تھا۔ وہ صرف خرد سے ہی تو بڑا ہے۔ بھابھیاں تو باہر سے آئی ہیں۔ اُن کا جذباتی تعلق نہیں ہو سکا، تو یہ اتنی دقت طلب بات نہیں ہے۔ جگر چھلنی تو اس لیے ہے کہ اپنے سگے بھائی اُس کے لیے اتنے سخت جان کیسے ہو گئے۔ وہ تو بھائی جان ہی کہتا آیا تھا اور اسی لفظ کی حرمت کے سبب خاموش رہتا۔

دونوں نے اُس کی دال روٹی بھر کے حق کو ادا کرنے کی کوشش بھی کب کی۔ وہ تو اماں کا دم تھا جو انھوں نے دونوں کو حکم دے دیا ورنہ کون جانے کیا ہوتا۔ وہ اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ انٹر کا نتیجہ بھی نہیں آیا تھا کہ سکندر کی چیتاونی جاری ہوگئی۔ ''بس ہوگئی پڑھائی۔ خط اور حساب لکھنا آ گیا ہے۔ کام دھندا دیکھو'' وہ ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ شادی کے بعد سکندر میں خاصی تبدیلیاں آئیں مگر وہ اتنا بدل گئے ہیں اس کا اندازہ، کمائی والے مطالبے کے بعد ہوا۔ اب تو وہ میدان کے ایک کونے میں کھڑا کسی گول کیپر کی طرح سب کی ٹھوکریں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

خرم کا قصور یہ تھا کہ وہ بے روزگار تھا۔ اس مُدّعا کو اُس کے بڑے بھائیوں نے اٹھایا جبکہ ترغیب اُن کی بیگمات کی تھیں۔ منجھلے بھائی شوکت شادی سے کافی عرصہ پہلے سے سعودیہ میں مقیم تھے۔ اُس کی بیوی شبنم اپنے مائیکے میں ہی رہتی۔ کسی ضرورت کے تحت یا آگ میں گھی ڈالنے کی غرض سے آجاتی۔ موبائل پر جٹھانی سے رابطے میں رہتی اور تمام منگنی، مُتنی کی خبریں تصاویر کے ساتھ حاصل کیے رہتی۔ سسرال میں باقاعدہ نہ رہنے کی وجہ سے جٹھانی، دیورانی میں گاڑھی چھن رہی تھی ورنہ اندر سے دونوں کتنی شاطر ہیں، یہ وہ خود بھی اچھی طرح جانتی ہیں؟

خرم کے لیے جب پیسے کمانے کا حکم صادر ہوا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ فوراً تو اُسے یقین بھی نہیں ہوا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ ابھی اتنا سمجھدار تو نہیں ہوا تھا مگر اُفتاد تو آن پڑی تھی۔ خرد اور اماں سے اس معاملے میں مشورہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صرف اختر بچتی ہے جو اُس کے لیے بے پناہ مخلص اور حد درجہ سمجھدار بھی۔ اتنی سنجیدہ اور دور اندیش خاتون سے وہ پہلے واقف نہیں تھا۔ اُس نے تو زیادہ تر عورتیں ایسی ہی دیکھی تھیں جو کپڑوں اور میک اَپ کی باتیں کرتی ہیں۔ گھریلو کون سے نسخے ہیں جن سے بال اور جلد کو زیادہ محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر مرد کا خیال اور خواہش ہے کہ عورت کا غیر جذباتی ہونا اُن کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اپنے بارے میں خرم کی رائے تھی کہ اُس کے اندر بہت صبر

وتحمل ہے مگروہ انترا سے ہار گیا تھا۔ اُس کے سامنے اکثر وہ اپنا صبر کھو دیتا۔ اُسے کہیں باہر چلنے کے لیے کہتا مگروہ کبھی راضی نہیں ہوئی۔ اس مسلسل انکار کی مصلحت خرم کو کافی دیر میں سمجھ میں آئی اور تبھی سے محبت کے ساتھ احترام بھی بڑھنے لگا۔

خرم نے اپنا مسئلہ انترا کے سامنے رکھا۔ اُس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور پھر دو دن بعد خرم کو ٹیوشن کرنے کا مشورہ دیا۔ آغاز کے لیے دو بچوں کے نام بھی سجھائے جن سے اُس نے پہلے ہی بات پکی کر لی تھی۔ انترا نے خود کی پڑھائی نہ چھوڑنے کے لیے اُس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی۔ اُس وقت وہ ہائی اسکول میں تھی۔ خرم آج سوچتا ہے تو اب بھی کبھی حیران ہو جاتا ہے۔ اپنے انتخاب پر اُس کی خوشی بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔

بچے دو سے چار ہوئے، چار سے آٹھ، اُس کی ٹیوشن گری چل پڑی تھی۔ کچھ بچے گھر آتے تھے، کچھ کو پڑھانے وہ اُن کے گھر جاتا۔ جن کے گھر پڑھانے جاتا تھا وہاں پیسے زیادہ ملتے تھے۔ بہت جلد وہ وقت بھی آ گیا کہ اپنے لیے وقت نکالنا مشکل ہو گیا۔ اقتصادی بحران تو ختم ہو گیا۔ وہ اماں کو پیسے دینے لگا۔ گھر کا سودا سلف بھی لے آتا۔ اپنی پڑھائی کے لیے وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری بھی کر رہا تھا، خود کفیل ہونے کی خوشی کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ وہ اماں اور خرد کے کپڑے لاتا تو اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا پاتا، کچھ عرصہ بعد قسطوں پر موبائل اور بائیک بھی خرید لی۔ ایک فون انترا کو بھی گفٹ کیا۔ اب بڑے بچوں کو بھی پڑھانے لگا تھا۔ محلے میں اُس کے پڑھانے کی تعریفیں ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے اُسے فیس بڑھانے میں مدد ملی۔ والدین مطمئن تھے کہ اُن کا پیسہ ضائع نہیں ہو رہا ہے۔

سکندر نے خرم کے سامنے جو ایک لکیر کھینچی تھی وقت کے ساتھ وہ گہری ہوتی گئی۔ انجم اور شبنم چوری چھپے اُس پر سیاہی ڈالتی رہیں۔ خرم نے اپنی طرف سے اسے صاف کرنے کی کوشش بھی کی مگر دونوں بھائی کان کے کچے تھے۔ اپنی بیوی کا کہا مانتے رہے۔

خرم وہ وقت کبھی نہیں بھول سکا۔ اُس کے دل میں نقش ہو گیا ہے۔ جب وہ تہی دست تھا۔ روز ملنے والا جیب خرچ بند ہو گیا۔ محبوب سے زیادہ دلفریب روزگار کا غم کیسے ہوتا ہے یہ اُس سے بہتر کون جانتا ہے؟ ورنہ اس سے پہلے تو وہ بھی شعر کا ہی لطف لے رہا تھا۔

انترا سے اُس کا رشتہ اور تعلق بالکل قصہ کہانیوں جیسا تھا۔ وہ کانیہ کبج براہمن تھی۔ اُس کے یہاں پیاز لہسن تک پر پابندی تھی۔ گھر کے باہر کے حالات مگر ایسے نہیں تھے جواب ہو گئے ہیں۔

چوبیس برس پہلے یہ کنبہ برابر والے اس مکان میں رہنے کے لیے آیا تھا، اُس وقت انترا چار پانچ سال کی رہی ہوگی۔ ہلکے پیازی رنگ کی فراک میں گول مٹول سی، بالکل کسی گڑیا کی طرح۔ پہلی بار میں ہی اُس نے توجہ کھینچی تھی۔ وقت کے ساتھ اور زیادہ اچھی لگنے لگی۔ عشق اور رشتوں کے اسرار بھی کھلنے لگے۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ خرم کے لیے وہ کبیدہ خاطر نہیں تھی۔ انترا کے والدین سے بھی خرم کو اُنسیت ہو گئی تھی۔ موبائل اُس وقت چلن میں نہیں تھا اس لیے سب کے پاس وقت ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے کا رواج بھی تھا۔

انترا کے والد ایک سرکاری بینک میں ہیڈ کیشیئر تھے جبکہ ماں ایک ڈگری کالج میں Physics کی پروفیسر تھیں۔ فنون لطیفہ میں دونوں کو گہری دلچسپی تھی بلکہ انترا کی ماں تو انگریزی میں نظمیں بھی کہتی تھی۔ فکشن کے مطالعہ کا شوق کافی تھا۔ موسیقی میں انترا کو زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ کئی ساز بجاتی بھی تھی۔ ستار کے لیے تو باقاعدہ ایک اُستاد رکھا گیا تھا۔ ادب اور ثقافت ایک ایسا مشترکہ موضوع تھا جس نے خرم کے لیے اس گھر کے دروازے وا کیے اور پھر بعد میں انترا نے اپنے دل کے بھی۔ پھر دونوں نے ساتھ ماسٹرس کیا۔ انترا نے سنگیت میں Ph.D شروع کر دی اور خرم UPSC کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اُن کے گھر خرم کا بچپن سے آنا جانا تھا۔ وہ بیٹھ کر مختلف موضوعات پر

صحت مند گفتگو کرتے۔ اتنے بے تکلف بھی ہو گئے تھے کہ کبھی مباحث بھی ہو جاتے۔

خرم کا ذہن کسی وقت خالی نہیں رہتا۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا۔ اس وقت بھی انترا کے بارے میں سوچتا ہوا چھت پر آ گیا۔ یہاں کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ جانے کس ضرورت کے تحت بنوایا گیا تھا مگر بعد میں کباڑ رکھوا دیا گیا۔ ایک دن اماں کو لگا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اُسے بھی علیحدہ کمرے کی ضرورت ہے۔ شادی کے بعد کی تب دیکھی جائے گی، فی الحال اس کمرے میں اُس کا گزر بسر ہو سکتا ہے۔ یہی سب سوچ کر انھوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا۔ کسی بات کو لے کر اماں اگر اس طرح اعلان کر دیں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ اُف بھی کر سکے۔ اُس در بے نما کمرے کا مالکانہ حق اُسے دے دیا گیا تھا۔ گرد و غبار سے اٹا ہوا۔ چاروں طرف مکڑی کے جالے اور بھی طرح کی گندگی تھی، جو کچھ دن کی محنت کے بعد رنگ لائی۔ اُس نے کمرے کا رنگ و روغن بھی کروالیا۔ کئی دن تک چونے اور پینٹ کی بُو اُسے پریشان کرتی رہی۔ چھت پر ایک عدد پنکھا بھی لگوالیا۔ ایک چھوٹا سا کولر بھی خرید لیا تھا۔ دن بھر تیز دھوپ میں تپنے کے بعد یہ کمرہ بھٹی کی طرح دہکتا تھا۔ کونے میں ایک چھوٹی سی الماری۔۔۔ جس میں کچھ کپڑے، اہم کتابیں اور ضرورت کا تھوڑا سا سامان قرینے سے لگا دیا تھا۔ اتنا سب کرنے کے باوجود ایک رات اچانک اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی ساری تگ و دو بے کار ہو گئی۔ علاقے میں لائٹ کچھ زیادہ ہی جاتی تھی۔ اُس روز کوئی بڑی خرابی کی وجہ سے رات بھر بتی گُل رہی۔ انورٹر (Inverter) کے تار کی اُس کے کمرے تک رسائی نہیں تھی۔ صبح اماں نے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں دیکھ کر دریافت کیا تھا اور اس نے ہاں، ہوں میں جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ انورٹر سکندر نے لگوایا تھا۔ ویسے سکندر بھی اُن کا فرمابردار بیٹا تھا مگر اُس سے بات کرتے ہوئے انھیں اپنے اختیارات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ ایک بار اماں نے سکندر کے کان میں یہ بات ڈالی بھی تو بڑی خوش اُسلوبی سے اُس نے اماں کو سمجھا دیا تھا۔ کہ پہلے ہی تین پنکھے چلتے ہیں۔ خرد کے یا آپ کے کمرے میں لیٹ جایا کرے۔ مزید پنکھے کی گنجائش تو

ممکن نہیں۔''

گنجائش کہاں سے نکالنی تھی؟ یہ اتنی معمولی سی بات ایک ماں اپنے بیٹے کو نہیں بتا پائی۔ ور گنجائش نکالنی بھی کس کے لیے تھی۔ اماں کی بازپرس کے باوجود اُس نے انہیں تسلی بخش جواب دے دیے تھے۔ وہ رات کس کرب و اذیت میں گزری تھی، اماں کو بتا بھی دیتا تو کیا ہوتا۔۔۔؟ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی یاد کرتا ہے تو ہُوک سی اُٹھتی ہے۔ اُس رات نیند سے جھگڑتے ہوئے وہ کیا کچھ سوچتا رہا تھا۔ انترا کے بارے میں، خرد اور گھر کے دیگر افراد کے بارے میں۔ اُسے یاد آتا ہے کہ کتنے اشعار رات کے تعلق سے اُس کے ذہن میں غیر ارادی طور پر آرہے تھے اور آخر میں ایک شعر سے تو وہ اُلجھ کر ہی رہ گیا تھا، حتیٰ کہ صبح ہو گئی تھی۔

''ہم تو رات کا مطلب سمجھیں خواب، ستارے، چاند، چراغ
آگے کا احوال وہ جانے جس نے رات گزاری ہو''

اُس دن اس شعر کے نئے معنی بھی اخذ ہوئے تھے۔ ویسی رات پھر نہیں آئی۔ لیکن جب یاد آتی ہے تو یہ شعر بھی ضرور یاد آتا ہے۔

چھت پر ایک اور سوگوار، تاریک شب اُس کے انتظار میں تھی۔ آج بارش کی وجہ سے موسم قدرے بہتر ہو گیا تھا ورنہ کل تک تو دیواروں سے بھبھکا سا نکلتا تھا۔ بجلی جانے کے بعد اُس کی یہ قید بامشقت بھی ہو جاتی۔ چھت کا کھلا حصہ خاصہ بہتر تھا۔ دو چار بالٹی پانی وہ ڈال دیتا تو زمین کی تپش کچھ کم ہو جاتی۔ آج بارش نے یہ آسانی کر دی تھی۔ جب کبھی اُمس زیادہ ہوتی تو وہ کولر چارپائی کے پاس گھسیٹ لیتا۔ انجم نے ایک متروک مچھردانی جو اُس کے کسی کام کی نہیں تھی، کافی پہلے اماں کے ذریعہ اُسے ہدیہ کی تھی۔ تب سے کباڑ کے ساتھ وہ کمرے میں پڑی تھی۔ کمرے کی صفائی کے وقت اُس نے باہر رکھ دی تھی اور خرد سے کہلوا بھی دیا کہ انجم اُسے اُٹھوا لے۔ کئی دن بعد اُسے اُٹھوا کر پوچھا بنا لیا گیا تھا۔ حالاں کہ اب گھروں میں جالے بھی پہلے کی طرح نہیں لگتے۔ کہیں ہوتے

بھی ہیں تو اُسے ہٹانے کے طور طریقے حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گئے ہیں۔

بستر پر لیٹنے کے بعد اُس نے کراں تا کراں آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں سے بھرا آسمان۔ گہری اندھیری رات میں کھلے آکاش کے نیچے لیٹنے کا تجربہ آپ بیان نہیں کر سکتے۔ جو لوگ بند اے سی کمروں میں سونے کے عادی ہیں۔ گو کہ وہ پہلے بھی کھلے میں لیٹتا تھا مگر تب اکثر لوگ ایسے ہی سوتے تھے۔ آج کیا خاص بات ہے جو اتنے زیادہ ستارے چمک رہے ہیں۔۔۔ جن کے گردش میں ہیں تو پھر وہ کہاں ہیں۔۔۔۔؟ وہ اپنے آپ ہی سوال جواب کر رہا تھا۔ ایسا کون سا تارہ ہے جو گردش میں نہیں ہے۔۔۔ اس سوال کے بعد وہ ٹھہر گیا۔ ہم لوگ کچھ بھی سوچ لیتے ہیں اور برملا اُس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں خواہ صورتِ حال کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو۔

اُسے علم نجوم سے کوئی شغف نہیں، شائد یہی وجہ ہو کہ اُس پر اعتبار بھی نہیں تھا۔ اگر کھیل سمجھ کر سوچا جائے تو کچھ دلچسپی کا سامان ہو سکتا ہے نصیب سے ستاروں کا کچھ تعلق مان لیا جائے اور یہ بھی کہ سب کی قسمت کا ایک ستارہ ہے۔ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کس کا کون سا ہے۔؟ خرم کو لگتا ہے کہ یہ معاملہ یقین اور بھروسے کا زیادہ ہے۔ جس کا جیسا عقیدہ و اعتبار، اُس کے لیے ویسے نتائج۔۔۔۔؟ پاس کہیں سے جھینگروں کی آوازیں عجب ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ کوئی توجہ سے سُنے اور آسمان کی بلندی کی طرف دیکھے تو لگتا ہے کہ ستارے ٹمٹمانے کے ساتھ جھنگر یا بھی رہے ہیں۔۔۔ بس ایک اُس تارے کو چھوڑ کر اگر سچ میں کہیں اُس پر خرم کا نام بھی لکھا ہے۔ اُسی وقت بادلوں کا ایک ٹکڑا کچھ آگے سرکا تو چاند پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوا۔ وہ کچھ لمحوں تک چاند کو ٹک ٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ کیا یہ وہی چاند ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس میں بہت داغ ہیں۔؟ شروع سے ہیں یا بعد میں ہوئے۔ وقت کے تغیر کے بھی تو ہو سکتے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے اپنی تاریخ کی افہام و تفہیم میں معاون بنے۔ معاً اماں کی لوری کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔۔۔ ''چندا ماما دُور کے، پُوڑے پکائیں بُور کے۔۔۔'' یہ

لوری اُس نے اماں کی آواز میں اتنی سُنی تھی کہ اصل گانے والی کی آواز بھی ذہن سے محو ہوگئی۔ لوریاں تو انہیں بہت یاد تھیں، اور آواز بھی بہت اچھی تھی مگر سب سے زیادہ یہی والی گاتیں۔ بہت دنوں تک وہ اماں کی لوریوں کو سُلانے کے حربے کے طور پر ہی لیتا رہا تھا بعد میں جب تھوڑا اور بڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے لیے ایک ماں کی ممتا اور جذبوں کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے لوریوں کی یہ نغمگی۔

جب سے خرم کے لیے اماں کے رویّے میں تبدیلی آئی تھی تب ہی ان لوریوں کی ایک نئی معنویت اُس کے سامنے کھُلی۔ لاشعوری طور پر اکثر وہ ان مناظر کو یاد کرتا۔ دیر تک اماں کی آواز اُسے حوصلہ دیتی۔۔۔۔خوش۔۔۔۔رکھتی۔ آج پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ اماں بتاتی تھیں کہ جب تمھارے ابّا کے ساتھ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر کسی عزیز کے یہاں یا گھومنے جاتیں تو کئی بار وہ اُن کی گود میں ہوتا تھا۔ اُس وقت سائیکل کا چلن معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لوگ آئینے کی طرح ہوتے تھے۔ خرم سب سے چھوٹا تھا۔ خرد اُس سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ اُس کی آمد سے متعلق حیرانی کی باتیں اب بھی کبھی ہو جایا کرتی تھیں۔ سکندر اور شوکت ہر بار اُسے اپنے پاس رکھنے کو راضی نہیں ہوتے۔ اُن کے کھیل میں رخنہ پڑتا۔ اماں ضد کیے بغیر اُسے اپنے ساتھ لے جاتیں۔

اُس وقت بھی ماہ وانجم کا یہ نظام اُسی طرح جاری وساری تھا۔ اُن دنوں چاند، تارے اُس کے لیے چمکنے والی چیز کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ سیاروں کی گردش کا علم تو بہت بعد میں ہوا لیکن اُس وقت چاند کا اُس کے ساتھ چلنا، ایک ایسا معمّہ تھا جسے کوئی حل نہیں کر پا رہا تھا۔ سائیکل پر بیٹھی اماں کی گود میں پڑا وہ چاند کو محوِ سفر دیکھتا رہتا۔

اماں اُسے کہانیاں بھی سناتی تھیں۔ انہیں بہت ساری کہانیاں یاد تھیں۔ جب کئی دن گزر جاتے اور وہ کہانی نہیں سناتیں تو خرم انہیں ٹوک دیتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ اچانک کیے گئے مطالبے پر انہیں کوئی کہانی یاد ہی نہیں آتی۔ یہ بات وہ تسلیم نہیں کرتا۔ بضد ہو جاتا تو اماں کو کہانی گڑھنی پڑتی۔ اتنے سلیقے سے وہ بات بنا لیتیں کہ خرم کیا اُس

کے ابا کو بھی نہیں معلوم ہو پاتا۔ یہ تمام وضاحتیں وقت کے ساتھ اپنے آپ ہی ہو جاتی ہیں۔ اماں سے اُس نے متعدد بار یہ سُنا تھا کہ وہ چھٹ پن میں بھی بڑا تجسّی تھا۔ کہانی سُنتے وقت سوال بہت کرتا تھا۔ ذہن کوئی بات قبول نہیں کرتا تو اماں سے دلیل مانگتا۔۔۔ ''یہ کیوں۔۔۔ ایسا کیسے؟'' ''اماں یہ چاند ہمارے ساتھ کیوں چلتا ہے۔۔۔؟'' اُس نے پہلا سوال کیا ''یہ بھی اپنی نانی کے گھر جاتا ہے۔۔'' اماں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''اسے راستہ کون بتاتا ہے، اور اس کے پیر بھی تو نہیں ہیں۔۔۔؟'' ایک ساتھ دو سوال کیے۔

''اس کو راستہ اللہ میاں بتاتے ہیں، اور اس کے پیر بھی ہوتے ہیں'' اماں کے جواب پر وہ چونکا تھا اور اماں کو زیادہ غور سے دیکھا بھی تھا۔ ''زیادہ دور ہونے کی وجہ سے دکھتے نہیں ہیں۔۔۔ سانپ کے بھی پیر نہیں ہوتے مگر وہ بھی چلتا ہے۔ چلنے کے لیے اللہ کی قدرت پاؤں کی محتاج نہیں۔۔۔'' سانپ والی دلیل اُس کی سمجھ میں زیادہ بہتر طریقے سے آئی۔ دور ہونے پر چیزوں کا نہیں دکھنا یا چھوٹا دکھنا بھی ذہن نے قبول کر لیا تھا۔ وقت نے اپنی مٹھی میں کتنے سارے بھید چھپا رکھے تھے۔ سب تو کسی پر نہیں کھلتے، البتہ کچھ معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی نے کبھی نہیں بتائی کہ بہت کچھ پاس ہونے پر بھی نہیں دکھتا یا شائد زیادہ قریب آنے پر غائب ہو جاتا ہے۔''

''اس کی نانی کا گھر کہاں ہے۔۔۔؟'' اُس نے بعد میں اماں سے یہ سوال بھی کیا تھا۔

''چندا ماما کی نانی کا گھر پھر کبھی پُوچھنا، تمھاری نانی کا گھر آ گیا۔ چلو اُترو۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اماں پہلے خود اُتری تھیں پھر اُسے گود سے نیچے اُتار دیا تھا۔ وہ نانی۔۔۔ نانی۔۔۔ کرتا ہوا اندر کی طرف بھاگا تھا۔ اپنی ہی آواز کی بازگشت اُسے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ ماضی سے حال میں لوٹتا ہے۔ اس تاریک اور اُداس رات میں چھت پر کوئی بنی نوع آدم یہ دیکھنے والا نہیں تھا کہ وہ افسردہ ہے۔ رفتگاں کی صدائیں اُس کا بیش قیمتی

اثاثہ ہیں۔ اپنے بڑے ہو جانے کی حقیقت پر وہ اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے نہیں روک سکا۔ چاند، سُورج کون سے بڑے ہو گئے۔ ایک وہ بھی اپنی ابتدائی شکل و ہیئت میں رہتا تو اُس کے لیے کتنی آسانیاں ہو جاتیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اُٹھ بیٹھا۔ صراحی سے کٹورے میں پانی نکالا اور پی کر بستر میں آ گیا۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب مزید کوئی بات اُسے تنگ نہ کرے۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ رونے پر تو جیسے تیسے قابو پا لیا تھا، اب سونا چاہتا تھا۔

صبح معمول کے مطابق اُس کی آنکھ وقت پر کھل گئی۔ رات وہ کتنی ہی دیر سے سوئے مگر صبح اپنے وقت پر اُٹھ ہی جاتا ہے۔ چڑیوں اور طوطوں کے جھنڈ نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ اذان میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ موبائل تکیہ کے نیچے سے نکال کر نیٹ (Net) چالو کیا۔ ڈھیر سارے میسیج، ویڈیو دھڑام سے آ گرے۔

اُٹھنے کے بعد چند لمحوں تک وہ بستر پر لیٹا رہا۔ پرندوں کا اسی طرح شور وغل کرتے ہوئے گزرنا اور طلوع سے پہلے کی یہ ساعتیں اُسے ہمیشہ سے گرویدہ کرتی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آگ کا ایک گولا نمودار ہو گا اور بہت کچھ منظر سے غائب ہو جائے گا۔ ستارے تو معدوم بھی ہونے لگے، ذرا دیر میں چاند بھی روپوش ہو جائے گا۔

پرندوں کے غول بڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ میں تعداد کے حساب سے شور بھی۔ صبح کے وقت ان کی آوازوں میں ردم کے ساتھ اصل چہچہاہٹ بھی شامل ہوتی تھی۔ ایک الگ ہی طرح کی کھنک جو واپسی پر میسر نہیں ہوتی۔ بچوں کو گھونسلوں میں چھوڑ کر تلاشِ آب و دانہ کی فکر سے یہ پرندے بھی آزاد نہیں اور تبھی ایک ساتھ کئی مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکروں میں گھڑ گھڑاہٹ ہوئی اور ایک ساتھ اسی ردم میں اللہ ۔۔۔ اکبر ۔۔۔ اللہ ۔۔۔ اکبر ۔۔۔ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ صبح نیم تاریک میں اذان کی گونج کا لُطف کچھ اور ہی ہوتا ہے شرط ہے کہ سُننے کے لیے پہلے سے آنکھ کھل چکی ہو۔ خرم کے پاس اب مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کے اثرات

چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اُس کا ارادہ تھا کہ اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو نماز کے بعد سونے کی کوشش کرے گا۔ وہ پھرتی سے اُٹھا۔ بستر لپیٹ کر رکھا۔ صراحی اُٹھا کر زینے کی طرف لپکا۔ نیچے لائٹ جل چکی تھی۔ اماں، ابا اُٹھے ہوئے تھے بلکہ ابا کو دروازے سے باہر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا۔

''مچھر۔۔۔ تو نہیں تھے۔۔۔؟'' اماں نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ زیادہ۔۔۔ نہیں تھے۔۔'' روز کی طرح اُس نے جواب دیا۔

چہرے سے تو لگ رہا ہے کہ سو نہیں پائے ہو۔۔۔'' سر کا مسح کرتے وقت اماں نے کہا۔ اُسے تعجب ہوا کہ اتنی باریکی سے اماں نے کب دیکھ لیا۔ وہ کس منہ سے اپنی ماں کو یہ بتاتا کہ اُس کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں اور اضمحلال مچھر کے کاٹنے سے نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ اماں کچھ اور کہتیں وہ تیزی سے بیت الخلاء کے اندر گھس گیا۔ فجر کی نماز میں آدھے گھنٹے کا وقت اذان کے بعد اسی لیے دیا جاتا ہے۔ جلد ہی وہ باہر نکل آیا۔ اماں اپنی چوکی پر نیت باندھ چکی تھیں۔ سکندر بھائی کا کمرہ معمول کے مطابق بند ہی تھا۔۔ خرد صرف جمعہ کو فجر پڑھتی تھی۔ خرم نے وضو کیا اور ٹوپی اُٹھا کر مسجد کے لیے باہر نکل گیا۔

خرم کا معمول تھا کہ نماز کے بعد وہ کچھ دیر مسجد میں ٹھہرتا تھا۔ کتاب پڑھی جاتی۔ دس منٹ کا اضافی وقت وہ دیتا۔ اس کے لیے کسی نے اُس سے کہا نہیں تھا۔ اُسے اچھا لگتا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ موتی جھیل پارک کا رُخ کرتا۔ وہاں جانے کا مقصد اُس کے لیے صحت کے تئیں احتیاط نہیں تھا۔ گھر سے فراری کے لیے صبح کا تھوڑا وقت بہت معقول بہانا تھا ورنہ تو ہر بات کی باز پُرس۔ کام۔۔۔ کرو۔۔۔'' وغیرہ۔۔۔۔ وغیرہ۔

خرم اوائل عمری سے دوسرے ہی مزاج کا تھا۔ ایک اشارے پر کسی کے لیے بھی قربان ہو جانے والا، بس ایک بہت معمولی شرط تھی کہ اُس کا اعتبار حاصل کر لیا ہو، پیار محبت کا ترسا ہوا گروہی بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھی کتابیں پڑھ کر اور کچھ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر چند اپنے فائدے کی باتیں سیکھ لی تھیں۔ اُن میں ایک بات یہ بھی تھی

کہ خاموشی سے بہتر کوئی جواب نہیں۔

سکندر اُس کا بڑا بھائی تھا۔ خرم کے لیے سب سے زیادہ کانٹے انھوں نے ہی انجم کے ساتھ مل کر بچھائے تھے ورنہ اتنی موٹی سی بات تو اُسے بھی معلوم تھی کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے اور اُس کی خانگی بھی سکندر بھائی کے ذمے نہیں ہے۔ اگر کبھی کچھ وقت کے لیے رہی بھی تو وہ جلد ادا کر دے گا۔ بہت کم عمری سے اُس نے انہیں کی وجہ سے کمانا بھی شروع کیا تھا۔ اماں کا اُس سے پیسوں کا مطالبہ اُن لوگوں کے کان بھرنے سے ہی سامنے آیا تھا۔ مسلسل ایک بوند پانی کی ایک جگہ گرنے سے پتھر درک جاتا ہے یا شگاف آجاتا ہے، یہ تو پھر انسانوں کا معاملہ ہے۔ اتنے دنوں کی جدّ وجہد اور محنت کو رنگ تو لانا ہی تھا۔

سحر اُس کے لیے دوسرے معنی رکھتی ہے۔ یہاں تو ابھی نانِ شبینہ کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ منظر کو پس منظر سے الگ رکھنے کی وہ بہت کوشش کرتا ہے مگر ہر بار کامیاب نہیں ہوتا۔ باہر کا سبزہ اُس کے اندر کے صحرا کو لمحاتی طور پر شادابی یا نمی کا احساس کرادے تو زندگی کے عبث ہونے کا خیال نکل جائے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتے رہنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ دو جون کی روٹی کی فکریں یوں اچانک ایک دن بنا انتباہ کے اُس کا محاصرہ کرلیں گی۔ یہ کب سوچا تھا اُس نے۔ اس خدشے کی کہیں سے بھنک بھی تو نہیں لگ پائی تھی۔ معاملہ صرف کھانے پینے کا ہی تو نہیں تھا۔ اُس پر کس کے کیا حقوق ہیں، یہ بھی بتایا گیا تھا۔ خیالوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خرم پارک میں داخل ہوا۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے سبب اِن دنوں پارک میں عام دنوں سے زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ ہر عمر کے لوگ تھے مگر بچوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ یہاں روز آنے والے دو اجنبی ایک دوسرے سے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ حال احوال جانتے ہیں۔ اگر کوئی کسی مسئلہ میں گرفتار ہے تو اُس کی دلجوئی کی جاتی ہے۔ ہمت افزائی کے ساتھ زبان سے صرف یہ کہنا کہ میں آپ کے لیے مخلص ہوں۔ اتنے بھر سے ہی کافی ہمت بندھ جاتی ہے۔ آدمی ٹوٹنے بکھرنے

سے بچ جاتا ہے۔زیادہ مایوسی ڈپریشن کی طرف لے جاتی ہے یا خودکشی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ایسے میں کوئی خیر کے دو بول بولنے والامل جائے،خواہ وہ غیر ہی کیوں نہ ہو،راہ کے کچھ کانٹے تو اُٹھا ہی لیتا ہے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد پارک آنے والوں کا خاصہ وقت! بہت بہتر انداز میں گزر جاتا ہے۔ یہ لوگ گھر واپس جاتے ہیں تو خوش گوار ماحول اور فکر کرنے والے لوگ اُن کے منتظر رہتے ہیں جبکہ خرم کے ساتھ ایسا نہیں تھا پھر بھی اُسے اسی آباد خرابے میں واپس آنا ہوتا ہے۔

وہ گھر کے قریب والی شاہراہ کے آخری موڑ پر آ گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹھہر کر دیکھا۔خاصی بھیڑ لگی تھی۔کانوں تک آ رہی آواز نے کافی کچھ واضح کر دیا تھا۔بہت کچھ منظر میں شامل نہیں تھا مگر وہاں موجود لوگوں کے ذہنوں میں خوف وہراس پیدا کر دیا تھا۔ خاصی تعداد میں نوجوان لڑکے اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔کئی کے ماتھوں پر ٹیکا یا چندن نہیں لگا تھا مگر کسی کے لیے نفرت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔زبان سے نکلتی ہوئی گالیاں اور انتہائی ہتک آمیز جملے۔۔۔۔شدید غصہ کا اظہار۔۔۔ فلک شگاف نعرے۔۔۔کچھ فاصلے پر خرم ٹھہر گیا تھا۔صورتِ حال کا اُسے اندازہ ہو گیا تھا وہ تھوڑا آڑ میں ہو گیا تھا۔اُس جگہ پر موجود اور لوگ بھی کہیں دُبک گئے تھے۔خرم اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اشتعال پھیلانے کے لیے ہی کیا جا رہا ہے۔اُس نے دیکھا تھا کہ آس پاس کئی دُکانوں کے شٹر گرا دیے گئے تھے۔لوگ گھروں کی کھڑکیوں ، دروازوں سے جھانک رہے تھے۔کئی لوگوں کو اُس نے ٹوپی اُتار کر جیب میں رکھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔جو شکلیں اُسے دِکھ رہی تھیں۔اُن پر خوف وہراس طاری تھا۔تھوڑی دیر میں نعروں کا شور کمزور پڑنے لگا۔بھیڑ واپس لوٹ رہی تھی۔شاید ان کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں اُس نے ہتھیار بھی دیکھے۔چند لمحوں کے بعد منظر تبدیل ہو گیا۔کثیر تعداد میں لوگ نکل آئے تھے۔ملی جلی آوازوں کے شور میں بہت گہرا سناٹا بھی پسرا تھا۔کسی بڑے طوفان سے پہلے والی خاموشی جیسا۔۔۔کچھ۔۔۔خرم سوچ رہا تھا کہ اس سکوت کا

شور کم ہو تو سانسوں کا زیر و بم بھی سنائی دے۔۔۔؟

پندرہ منٹ مزید اُس نرغے نے اجتماعی طور پر اپنی نفرتوں کا مظاہرہ کیا۔ گلے نہ بیٹھ گئے ہوتے اور کلیجے میں جان ہوتی تو شاید وہ ابھی کچھ دیر اور یہ تماشا کرتے۔ کسی طرح کا منفی ردِ عمل نہ ہونے سے بھی وہ مایوس ہوئے تھے۔ لوگوں کو ہلتے ڈُلتے دروازوں کی آڑ میں خرم نے دیکھا تھا کہ کچھ پولیس والے بھی وہاں موجود تھے۔ اُس کی آنکھیں تھوڑی اور پھیل گئیں چہرے کی لکیریں کچھ اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ خرم تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا ڈر پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اُس کے باپ کا وہ گھر جس سے وہ فراری اختیار کیے رہتا، آج اُس در و بام کی اہمیت کچھ اور ہی ہو گئی۔ وہ گھر پہنچنے کی جلدی میں تھا۔ اتنی تیز تو وہ پارک میں نہیں چلتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنی چوکھٹ پر پہنچ ہی گیا۔ اُسی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ چہرے پر اب تک ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ اماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اماں بھی کچھ فکر مند دکھیں۔ ”کہاں۔۔۔ رہ گیا۔۔۔ تھا۔۔ رے۔۔۔ پتہ نہیں تجھے، سڑک پر کیا ہو رہا ہے۔ ایسے حالات میں بھی چُوتڑ گھر میں نہیں ٹکتے۔۔۔ اِتنا تو سوچ لیا کرو کہ گھر میں بھی کوئی فکر کرنے والا بیٹھا ہے۔۔“ وہ بے نقط شروع ہو گئیں۔ اُسے اس بات پر حیرت بھی تھی کہ اماں کا نیٹ ورک بڑا مضبوط ہے۔ سارے معاملے کا وہ خود چشم دید گواہ ہے۔ وہاں سے گھر تک کتنی تیزی سے آیا ہے مگر اماں کے پاس تمام اطلاعات اُس سے پہلے ہی پہنچا دی گئیں۔ اُس نے دیکھا تھا سکندر سبزی لے کر بائیک سے لوٹ رہے تھے۔ اماں کے آخری جملے پر اُس نے اُن کی طرف دیکھا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ واقعی کسی کو اُس کا انتظار رہتا ہے۔ وہ ماں کے سامنے کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ کوئی بات کبھی جب زیادہ ہی بُری لگتی تو جواب میں وہ انہیں زیادہ غور سے دیکھتا تھا اور اماں اس بات سے واقف تھیں۔ ”اچھا۔ ٹھیک ہے۔۔ مگر گھر میں رہا کرو۔۔۔“ زبان سے کچھ نہ کہنے کے باوجود اماں نے اُس سے کہا اور پھر خاموش ہو گئیں۔ خرم کے بہت

تیز بھوک لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اماں سے کہا کہ خرد سے چائے بنانے کو کہہ دیں میں تب تک نہا کر آ رہا ہوں۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ باہر دالان میں اماں کی چوکی کے سامنے لوہے کی ایک زنگ آلود کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جب بھی اس کرسی پر بیٹھتا اُسے اپنی ایک پُرانی چوٹ یاد آ جاتی۔ خرم جھک کر اپنے دائیں پاؤں کو دیکھتا ہے۔ ٹخنے کے پاس ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ بعض نشان کبھی نہیں جاتے اس خیال کے ساتھ وہ اُس واقعہ کو یاد کرنے لگا۔ وہ اُس وقت سات، آٹھ برس کا رہا ہوگا۔ تب یہ کرسی نئی تھی اسی لیے ضد کر کے پڑھائی کا بہانا کرتے ہوئے کرسی پر اپنا حق جما لیا تھا۔ روز کی طرح ایک دن وہ ہوم ورک کر رہا تھا کہ کرسی ٹوٹ گئی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ اچھا خاصہ کٹ گیا تھا۔ اماں تو بُری طرح گھبرا گئیں تھیں۔ اُس دن بھی وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ ماضی سے لوٹتا ہے۔ اماں اُس کے سامنے چوکی پر نماز پڑھنے میں مشغول ہیں۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ اماں نے سلام پھیرا تو اُس کا ذہن تھوڑا اور منتشر ہوا۔ یہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا۔ خالی وقتوں میں اماں قضائے عمری شروع کر دیتی تھیں یا کوئی اُفتاد آتی، تب بھی نیت باندھ لیتیں۔ تیز بارش یا بجلی کے زیادہ کڑکنے پر بھی ہَول جاتیں۔ ''اللہ۔۔۔ ناراض ہو رہے ہیں۔۔'' کہہ کر مصلّے پر کھڑی ہو جاتیں۔ مختصر سی دُعا مانگ کر قرآن جو رحل پر اُن کی چوکی کے دائیں طرف ہمہ وقت موجود ہوتا، اپنے آگے سرکا لیتیں اور تلاوت شروع کر دیتیں۔ کنکھیوں سے چاروں طرف کا جائزہ لیے رہتیں۔۔۔ کھڑکی سے باہر جھانکنا ہوتا تو اتنی دیر انگشت اُس جگہ رکھے رہتیں جہاں پڑھ رہی تھیں۔ خرم کی طرف ایک سرسری سی نظر ڈالی۔

''ناشتہ کر لیا۔۔۔'' سوال خرم سے کیا مگر آنکھیں قرآن کے صفحات پر تھیں۔ مطلوبہ صفحہ کے لیے اوراق پلٹ رہی تھیں۔

''جی۔۔۔'' آہستہ سے اُس نے جواب دیا۔ وہ پھر سے تلاوت میں منہمک ہو گئیں۔ خرم کا دھیان اُس منظر کی طرف گیا جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنی جاگتی آنکھوں

سے دیکھا تھا۔ قہر و غضب میں ڈوبی آوازوں کی بازگشت اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ اُن نعروں سے اُن کی غرض وغائت کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر ماں کے قریب آ گیا تا کہ قرآنی آیات کو زیادہ واضح طور پر سُن سکے۔ اُس نے اماں سے بھی آواز بڑھانے کو کہا۔ قرآن کی آواز اس طرح سنا جیسے یہ اُن نعروں کا تریاق ہو۔ وہ اپنی تمام توجہ اور انہماک اماں کی طرف کر دیتا ہے۔ اماں کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ خرم آنکھیں بند کر کے تلاوت سننے میں محو ہو جاتا ہے۔ اُس کی سماعت میں اور کوئی آواز باقی نہیں رہتی ہے۔

تین دہائی قبل یہ بستی اس شکل میں نہیں تھی۔ اکثر مکانوں پر تو چھت ہی نہیں تھی۔ کھپریل یا سیمنٹ کی چادروں سے سائبان کیے گئے تھے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے یہاں مقیم تھے مگر اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مسلم ہر شعبہ میں باقی ماندہ سے بہت پیچھے تھے۔ اس کے لیے قصوروار کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تعلیم کی اہمیت کو اس طرح ابھی تک قبول نہیں کر پائے، جس طرح کرنی چاہیے تھی۔ تنگ و تاریک گلی کے اندر چھپّر ڈالے رہنے والا کوئی محسن ہو یا عرب کا کوئی بڑا تاجر۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم کا حصول، بہتر اور آرام دہ زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے اور بس۔

ملک کے کسی شہر میں چلے جائیں اور اقلیتی محلّوں کا حال دیکھ لیں۔ کوئی بہت خاص تبدیلی نہیں ملے گی۔ بیشتر پُرانی اور پھسپھسی عمارتیں۔ کتاب، مرغ، اور بریانی کے دیگ اور بھی خورد و نوش کے خوانچے لگے ہوتے ہیں۔ چائے خانوں پر چند بزرگ ہمہ وقت موجود رہتے۔ کٹنگ چائے اور اردو اخبارات سے حاصل کیے علم پر تمام دن بحث و مباحثہ کرتے۔ سیاست اور کرکٹ اُن کے پسندیدہ ترین موضوعات تھے۔ رات دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ گھنی اور گنجلک آبادی۔ اکثریت غریب، غربا کی ہوتی۔ زیادہ تر مرد حضرات گھروں سے باہر رہتے۔ گلی، محلّوں میں بہت شور برپا رہتا۔ کچھ نو جوان معاشی تنگی کی وجہ سے چھوٹے موٹے جرائم بھی کر لیتے۔ مجموعی طور پر صورت حال

یہاں بھی اطمینان بخش نہیں تھی۔

''جہاں مانگنے سے مل جاتا ہو، وہاں چوری کا جواز نہیں بنتا۔؟'' اس طرح کی باتیں اب قصے، کہانیوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ کبھی ہماری زندگی کا یہ معیار بھی تھا۔ اب ایسی تمام اچھی باتیں یاد کر کے خوش ہو لینے کے لیے ہی تھیں۔ وقت کے ساتھ منظرنامہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ عروج سے زوال کی طرف تو کبھی زوال سے عروج کی سمت۔ اب حق مانگنے سے کم ہی لوگوں کو ملتا ہے۔ اب چھیننا پڑتا ہے مگر اب نئی اُفتاد آن پڑی ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کی فہرست میں اگر کسی کا ایک بار بھی نام شامل ہو گیا تو کسی وقت بھی انہیں گھر سے اُٹھا لیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ضمانت کے لیے یہاں کتنی آسانیاں ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ کئی بار تو ایسی خبریں بھی سُننے کو ملیں کہ فہرست میں نام ہونے کی بھی کیا قید؟ دیکھتے دیکھتے وہ وقت بھی آیا کہ تشخص پر سوالیہ نشان لگنے لگے۔ ہاتھوں کے ہنر اور مختلف کاموں کے عمدہ کاریگر جو اپنے کنبوں کی بُود و باش کا ذریعہ تھے، زنداں کی بُلند و بالا فصیلوں کے اُس طرف دھکیل دیے گئے، سورج طلوع ہونے پر آسمان کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھتے ہیں اور شام کو آفتاب کے غروب ہونے کے ساتھ روشن امکانات بھی اُن کے لیے معدوم ہو جاتے ہیں۔

بڑی تعداد میں اس علاقے کے لوگ خلیجی ممالک کی طرف چلے گئے تھے۔ روزی کی تلاش کسی کو کہیں بھی لے جاتی ہے۔ وہاں جانے والے اقتصادی بحران سے کسی حد تک نجات پا چکے تھے۔ اس کے عوض گھروں سے دور رہنے کی صعوبت اور اذیت وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتے۔ غیر متوقع طور پر انہیں ایک فائدہ نصیب ہو گیا۔ یہ معاملہ تھا اپنے تحفظ کا۔؟ نئے لوگ بھی اس نقطۂ نظر سے ہجرت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

خرم کے منجھلے بھائی شوکت جو دنیاداری میں بہت تیز تھے۔ کئی برس پہلے جوڑ توڑ اور جُگاڑ سے سعودیہ پہنچ گئے تھے۔ بڑے بھائی سکندر کا آٹو موبائل کا کام چل نکلا تھا جس کے سبب اُن کی غریبی دُور ہو گئی تھی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر گھر کا کھپریلا اُتروا دیا تھا۔

اُن کے حالات خاصے بہتر ہو گئے تھے گو کہ ابھی بڑی تعداد میں ایسے لوگ تھے جو جدّ وجہد کر رہے تھے۔ آسائش کے متعلق تو وہ تب سوچتے کہ اُن کی دال روٹی کی آسودگی ہو گئی ہوتی۔

خرم کے ذہن میں پرانے گھر کے نقش ونگار بہت واضح طور پر محفوظ تھے ہر چند کہ وقت کی گرداتنے عرصہ میں منظر کو دھندلا کر دیتی ہے مگر وہ ماضی کو سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ یادیں اُس کی تربیت کی اساس تھیں۔۔۔۔ دادی، دادا کا وہ پُرانا گھر۔۔۔۔ اُس کے بام ودر۔۔۔۔۔ محراب۔۔۔۔ طاقیں۔۔۔۔ ڈیوڑھی۔۔۔۔ منقش چوبی دروازہ۔۔۔۔۔ گھڑونچی۔۔۔۔ اُس پر پانی سے بھرے مٹی کے گھڑے، صُراحی۔۔۔ قلعی کیے ہوئے نقرئی کٹورے، گلاس۔۔۔ الماریوں میں کھڑی المونیم اور تام چینی کی رکابیاں اور بھی کیا کیا کچھ ۔۔۔؟ جب جی چاہا چپکے سے گئے دنوں کی کھڑکی کھول لی۔ ماضی کی صدائیں اور خوشبو کے جھونکے کے ساتھ دھنک رنگ اور جگنو میں لپٹی روشنی کسی حد تک اُس کے آس پاس کی تاریکی کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر دور تو کر دیتی ہے۔

اس گھر میں موٹے پٹرے والا چوبی دروازہ جس پر کسی طرح کی نقاشی بھی نہیں تھی بلکہ لکڑی بھی بہت اچھی والی نہیں تھی۔ اب چیزیں بھی پہلے جتنی پائیدار نہیں ہوتیں۔ گھر میں ٹوٹ پھوٹ نہ ہوئی ہوتی تو وہ پُرانا دروازہ بھی اب تک نہ ہٹایا گیا ہوتا۔ اماں کی مرضی تو یہی تھی مرمت کر کے اسے ہی لگا دیا جائے مگر اُن کی چلی نہیں۔ اماں جانتی تھیں اور اکثر کہتی بھی تھیں کہ سکندر کی دلہن، ایک بار کسی بات کے لیے نہیں کر دے تو کسی کی مجال نہیں کہ اُس سے ہاں کروا لے۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر قاضی کے سامنے ہاں کر دی تھی۔ آخری جملہ آہستہ سے کہا تھا۔ وہ قدیمی دروازہ، جس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں تھی، کسی کو ہدیہ کر دیا گیا۔ اماں کو وجہ یہ بتائی گئی کہ اب اس طرح کے دروازے چلن میں نہیں ہیں۔"

"اے بچّی۔۔۔۔ چلن میں تو اب ہمارے جیسے لوگ بھی نہیں ہیں۔ ہم بڑھیا

بڑھے کو بھی کسی کی چوکھٹ پر ڈلوا دو"۔ اماں جب انجم سے جھگڑتیں تو انجم اُن کے سامنے زیادہ زبان نہیں چلاتیں، ویسے بھی وہ کہنے کے بجائے کرنے میں یقین رکھتی تھی۔ وہ ٹھنڈا کر کے کھاتی تھی۔

گھر کی دہلیز کو عبور کرتے ہی بڑا سا صحن تھا۔ بائیں طرف گھڑونچی بنی ہوئی تھی، جس پر مٹی کے دو بڑے گھڑے اور ایک صراحی رکھی ہوئی تھی۔ ایلومینیم کی رکابیوں سے اُن کے منہ ڈھنکے ہوئے تھے۔ دیوار پر لگی ایک کیل میں ایک عدد ڈوئی بھی لٹکی ہوئی تھی۔ دو خوب چوڑے منہ کے مرادابادی کٹورے رکھے ہوئے تھے۔ قلعی کی وجہ سے وہ چمکتے ہی رہتے تھے اور ماند پڑنے سے پہلے قلعی والا آدھمکتا۔ محلے کے بچوں کے لیے وہ دن بھر کا تماشا ہوتا۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب چیزوں کو صاف اور چمکدار رکھنے کے لیے کیا اہتمام کیا جاتا۔ میدانوں میں پانی چھڑکنے کے لیے بہشتی آتا تھا اور لحاف، گدوں کی روئی دھننے والے بھی آتے تھے۔ بچے تمام دن محاصرہ کیے کھڑے رہتے۔ اُس میں بھی کیا لُطف ہوا کرتا تھا۔

اُس زمانے میں دروازوں میں کنڈیاں بھی اور طرح کی ہوتی تھیں۔ اُس طرح کا اثاثہ کم لوگوں کے پاس ہوتا تھا، جس کے لُٹ جانے کا خوف ہو۔ اس لیے قفل بھی بس کہنے بھر کے لیے ہی استعمال ہوتے۔ اس دروازے میں ایک آہنی کنڈی انگریزی ہندسے کے آٹھ کی شکل میں ہوا کرتی تھی۔ رات میں ہنڈیا کا چمچ یا کفگیر تالے کے نام پر اس میں ڈال دی جاتی۔ تب تک لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہوئے تھے کہ اپنے اخلاص یا محبت کے اظہار کے لیے سیاق وسباق پر بھی غور کرتے۔ تنگ دستی کے باوجود خلوص کے معاملے میں بہت متمّول۔ اتنے سادہ اور بھولے لوگ ہوا کرتے تھے کہ پڑوس میں کوئی کسی سے کچھ بھی مانگ لیتا تھا۔ آٹا۔۔۔۔۔ چاول۔۔۔ شکر۔۔۔ چائے۔۔۔۔ نمک۔۔۔ ماچس کی تیلیاں تک مانگی جاتی تھیں۔ کچھ تو چولہے جلانے کے لیے آگ بھی طلب کرتے۔ سالن نکالنے والا گھر کا سب سے بڑا چمچ لیے کوئی بچہ یا خاتونِ خانہ خود ہی

آ جاتیں۔۔۔۔"باجی۔۔تھوڑی سی آگ۔۔دے۔۔دو۔"اس سے لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس کا چولہا کس وقت جلتا ہے اور کب انگارے تقسیم کرنے کی صورت میں ہوئے ہیں۔ بیتے وقت کی یہ صدائیں جن لوگوں کو سنائی دیتی تھیں، اُن میں خرم بھی شامل تھا۔ یہ تہذیب اور اقدار کے فنا ہونے کا وقت ہے۔ وجود کا تحفظ بھی خطرے میں ہے وہ بُرے کو بُرے کہنے والوں کی صف میں کھڑا ہے بس۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ ایسے میں کسی حساس آدمی سے کچھ شغل نہ کرنے کا کرب بھی دریافت نہیں کیا جاسکتا۔؟

خرم کے مالی حالات پہلے سے خاصے بہتر ہو گئے تھے۔ صبح سے شام تک ٹیوشن میں مصروف رہنے لگا تھا۔ قسطوں پر ایک بائیک بھی خرید لی تھی اماں کے ہاتھ پر بھی پیسے رکھنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کا بھی کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ خرد کے لیے کئی سوٹ لے کر آیا تھا۔ اماں چوکی پر بیٹھ کر سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ خرم کی طرف سے اُن کی خفگی میں کمی آئی تھی مگر اُس کے لیے پھر بھی گھر کے حالات سازگار نہیں ہو پائے تھے۔ ماں سے بہتر اپنے بچے کی نفسیات اور کون جانتا ہے؟ انہیں معلوم تھا کہ وہ اُن کی اور اولادوں سے بہت الگ ہے۔ اُس کی نظر میں پیسے کی اہمیت ہوتی تو شائد سب سے زیادہ فراوانی اُسی کے پاس ہوتی۔ اُسے دوسروں کا اعتبار حاصل تھا۔ اُن میں صاحب ثروت بھی تھے۔

اماں نے اس حوالے سے سکندر سے بات بھی کی تھی اور سکندر نے ماں کو بھروسا بھی دلایا تھا کہ وہ انجم سے بات کرے گا اور ہم سب مل کر اُس کے لیے اجتماعی طور پر کچھ مثبت سوچیں، اور کریں گے بھی لیکن بیگم کے سامنے جاتے تو زبان تالو سے لگ جاتی۔ انجم کے سامنے سکندر کی ایک نہ چلتی۔ دراصل وہ اتنی شاطر اور عیار عورت تھی کہ سکندر کو کبھی یہ اندازہ بھی نہیں ہو پایا۔ وہ بہت غور و فکر کے بعد کوئی قدم اُٹھاتی اور تصویر کا منفی رخ خود ساختہ دلائل کے ساتھ سکندر کے سامنے رکھتی تو خاموش رہنے کے علاوہ سکندر کے پاس بھی کچھ نہیں بچتا۔ خرم کو یہ بھی اندازہ نہیں ہو پایا کہ سکندر اُس کے بارے میں یہ نہیں

سوچ رہے تھے۔اس کی بھابھی انجم کس طرح اُسے بُرا بنائے ہوئے ہے۔وجوہات جو بھی ہوں، خرم کی کڑھن تو بڑھ رہی تھی۔اُس سے جو توقعات تھیں اور مطالبے کیے گئے۔ کسی حد تک وہ پورے کر رہا تھا مگر اس کی دشواریاں کم نہیں ہو رہی تھیں۔صبر وضبط والا آدمی تھا اور ابھی مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔

کئی دن سے خرم کو بریانی کھانے کی خواہش ہو رہی تھی۔خرد کے ذریعہ گھر میں اس مطالبے کی تکمیل ممکن بھی تھی مگر وہ گریز کرتا تھا۔آج صبح اُٹھنے کے بعد اُسے لگا کہ آج اُسے بریانی کھانے جانا ہی ہے۔وہ اچھے کھانوں کا شروع سے شوقین رہا ہے، اب تو شعور بھی آ گیا ہے اور جیب میں پیسے بھی ہیں۔

مسلم اکثریت والا وہ علاقہ جہاں خورد ونوش کی فراوانی تھی۔انواع واقسام کے خوش ذائقہ کھانوں کے ڈھیر سارے ریستوراں اور خوانچے لگے رہتے تھے۔یہ جگہ اُس کے گھر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔اُس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ ضیافت کی بریانی کھائے گا کیونکہ شہر میں خرم کو سب سے زیادہ ضیافت کی ہی بریانی پسند تھی۔اُس نے ایک شناسا کے پاس اپنی بائیک کھڑی کی اور چہل قدمی کی غرض سے ٹہلنے لگا۔اُس کا ننہال، ددھیال اور کئی قریبی رشتہ دار یہیں آس پاس میں مقیم تھے۔یہاں کے تمام گلی، کوچوں سے وہ صرف واقف ہی نہیں تھا بلکہ مانوس بھی تھا۔یہاں صبح سے ہی عمدہ اور لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھنے لگتیں اور دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پلاؤ، بریانی، نہاری، حلیم، کباب پراٹھے، سیخ بوٹی، کلیجی، فرائی مرغ وماہی۔۔۔اور بھی جانے کیا کیا۔۔۔دھوئیں کے ساتھ تیرتی ہوئی خوشبوئیں اس کی بھوک اور زیادہ بڑھا رہی تھیں۔وہ چوڑی والی گلی کے اندر مڑ گیا۔یہ گلی کبھی اُس کے مدرسے جانے کا راستہ تھی۔وہ اپنی یادوں کو تازہ کرنے کی غرض سے ایسے مقامات پر جاتا رہتا۔لوگوں سے ملنے کی کوشش کرتا۔کئی دن پہلے سے اُس کے ذہن میں وہ مقام یا شخص دستک سی دیتا۔

اُس زمانے میں یہ گلی چاندی کے ورق کوٹنے والوں کا بڑا مرکز ہوا کرتی تھی۔

خرم جب بستہ سینہ سے دبا کر اس گلی سے گزرتا تو کھٹ ۔۔۔کھٹ ۔۔۔کھٹ کھٹ ۔۔کی ایک ردم کے ساتھ نکلتی ہوئی وہ نقرئی آوازیں اُسے صرف اچھی ہی نہیں لگتیں بلکہ گرویدہ کرتیں۔وہ چاہتا تھا کہ ٹھہر کر دیر تک سنتا رہے۔کئی بار اسی وجہ سے مدرسے پہنچنے میں تاخیر ہوئی جہاں مولوی صاحب نے اُس کی حجامت بنائی۔اُن صداؤں کی بازگشت بھی اُس کی سماعت میں محفوظ تھی۔تواتر کے ساتھ وقفہ کی طے شدہ سماعت اور پھر ایک ٹناکے کی آواز۔۔۔کھٹ کھٹ۔۔۔وہ آوازیں اب اس گلی سے نہیں آتی ہیں مگر گزرو تو خود کو یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اب وہاں بجی دھجی پیکنگ والے سامانوں کی دکانیں ہیں۔نکّڑ پر آزادی سے پہلے کا ایک کافی ہاؤس تھا، وہاں اب انگریزی شراب کی دکان کھل گئی تھی۔اس قدر خارجی تبدیلی کے باوجود خرم کے ذہن ودل میں وہی پُرانہ منظر آوازوں کے ساتھ خون میں بھی تحلیل تھا۔

اُس وقت آرام وآسائش کے یہ اسباب نہیں تھے مگر دلوں کو سکون بہت تھا۔لوگ رشتوں میں اداکاری کے ہنر سے واقف نہیں تھے۔پہلے بازار میں بھی ایسا بازار نہیں تھا، اب تو بازار گھر تک آگیا ہے مگر پھر بھی راحت میسر نہیں ہے۔اب تو چہروں پر تصنع کا غازہ پوتے ہوئے اُس وقت محرومیوں کے بھی رنگ ہوا کرتے تھے۔اتنی غربت اور تنگی کے باوجود لوگ خوش رہتے تھے۔اب اتنا پیسا آرہا ہے۔ ہر طرف سے جیبیں ہی نہیں الماریاں بھی بھری ہیں۔بینک کے کھاتوں میں بھی جمع ہے مگر ساعت نشاط کی تلاش میں سرگرداں۔۔۔؟وقت کی چکی بہت مہین پیستی ہے۔اور اپنے حساب سے تقسیم کرتی ہے۔

سکندر کے بچے اسکول سے آگئے تھے۔انجم اُنکے کپڑے وغیرہ تبدیل کروا رہی تھی۔ بچے شرارت کے مُوڈ میں تھے ویسے بھی اسکول جانے اور واپس آنے میں اکثر بچوں کے موڈ میں بڑا تضاد ہوتا ہے۔دونوں بھائی ٹیب (Tab) کے لیے جھگڑنے لگے۔ماں نے سختی سے ڈانٹ لگائی۔"چلو اومت۔۔۔۔ورنہ پیٹ کے دھر دوں گی۔"

''ممّا۔۔۔یہ چلواو۔۔کیا ہوتا ہے۔۔آٹھ سالہ زید نے دریافت کیا۔''پریشان اور تنگ کرنے کو کہتے ہیں۔''انجم نے سامان سمیٹتے ہوئے جواب دیا اور آگے بولنا شروع کیا۔''آج لائٹ بھی جلدی چلی گئی جس کی وجہ سے ادرک لسن (لہسن) بھی نہیں پیس پائے۔''خرم فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ جملہ اُس کو سنانے کے لیے کہا گیا ہے۔کبھی کوئی بہت خاص خبر یا میچ دیکھنے کے لیے ہی وہ کمرے میں آنے کی ہمت جٹا پاتا تھا۔اس کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے اُسے کچھ وقت بھی لگتا۔ایسا نہیں تھا کہ بس مُنہ اُٹھایا اور آ گئے۔بجلی نہ ہونے کا دکھڑا اس سے پہلے بھی وہ کئی بار رو چکی تھی۔اماں نے ایک مشورہ بھی عنایت فرمایا تھا کہ''دُلہن۔۔ایسے حالات میں سِل بٹا چھونے کا گناہ کر لیا کرو۔یقین جانو۔۔اللہ کے یہاں پکڑ نہیں ہوگی۔''وہ اماں کو جواب تو نہیں دیتی مگر طعنہ گرہ سے باندھ لیتی۔خرم کے لیے اب کمرے میں رُکنا ناممکن سا تھا۔وہ واپسی کے لیے مُڑنے ہی والا تھا کہ پانچ سالہ عدنان چاچا سے مخاطب ہوا۔''چاچو۔۔آپ کو W.T.C کا Demolish دیکھنا ہے۔''خرم کے پیر وہیں جم گئے۔اُسے لگا کوئی نیا گیم (Game) آیا ہوگا۔

''تم .W.T.C جانتے ہو۔؟''اپنی حیرت کو دباتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''World Trade Center کو .W.T.C کہتے ہیں چاچو۔۔۔آپ کو یہ بھی نہیں پتہ۔خرم والی حیرت اب عدنان کے چہرے پر تھی۔

''نہیں۔۔''بہت آہستہ سے اُس نے کہا مگر عدنان نے سُن لیا۔

''ہمارے اسکول میں ایک پلے (Play) کی ریہرسل (Rehearsal) چل رہی ہے۔ٹون ٹاورس (Twin towers) کے گرنے والے ویڈیوز ہم لوگوں کو دکھائے گئے ہیں اور کیس ہسٹری (Case History) بھی بتائی گئی ہے۔اُس کے ذہن میں آیا کہ وہ دونوں سے پوچھے کہ انہیں Case History میں کیا بتایا گیا ہے۔اور کیا چھپایا گیا ہے۔۔۔کیا انہیں بتایا گیا کہ تاریخ میں پہلی بار کوئی انسان سومنزلہ

عمارت سے اپنی جان بچانے کے لیے کودا ہے۔؟ ظاہر ہے یہ بچوں کو نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ پھر انہیں بتایا کیا جا رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے ان تمام سوالوں کے جوابات، لاشعوری طور پر اُس کے ذہن میں آ گئے۔

کمرے سے باہر آنے پر خرم کی نظر خرد پر پڑی۔ وہ کالج جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ ایک کتاب لیے وہ خود کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد انجم کے کمرے سے روز پابندی سے دیکھے جانے والے ٹی وی کے روایتی دورانیے کی آوز سنائی دی۔ والیوم جان بوجھ کر تیز کیا گیا تھا۔۔ اماں حکیم جی کے یہاں اپنی دوا لینے گئیں ہیں۔ اس وقت کا فائدہ کسی طرح اُٹھایا جا سکتا تھا، یہ سبیل انجم نے نکال لی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ خرم کو ضرور تکلیف پہنچے گی۔ محبت ہو یا نفرت، یہ اظہار کے بغیر بھی تو کی جا سکتی ہے۔ یہ اُس کا خیال تھا۔ خرم اپنا دھیان اُدھر سے ہٹانا چاہتا تھا کیوں کہ اُس پر زیادہ توجہ دینے کا مطلب انجم کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا تھا۔ اُس کی نظر ایک بار پھر خرد کی طرف گئی۔ وہ اپنی تیاری پر اب زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ خرم یہ بات کافی دنوں سے نوٹس کر رہا تھا۔ کوئی تبدیلی اچانک تو نہیں ہوتی۔ اُس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ وہ تمام اسباب پر خاموشی سے بہت غور و فکر کر رہا تھا۔ دکھائی خرم کو بھی اتنا ہی دے رہا تھا جتنا باقی لوگ دیکھ پا رہے تھے مگر وہ لیموں کو دوسروں کے مقابلہ تھوڑا زیادہ نچوڑتا تھا۔ خرد سے اُس کی بہت قربت رہی ہے اُس نے اُسے جوان ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ اُس کے مزاج اور نفسیات سے خوب واقف ہے مگر اُس بادِ تُند کا کیا کرے جو بے اعتباری کے نام سے چل رہی ہے اور بہت تیز چل رہی ہے یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے، کہ یہ نہیں ہو سکتا؟ رشتوں کی نزاکت اور باریکیاں وقت کے ساتھ اپنی قدر و قیمت طے کرتے ہیں۔۔ یہ دائمی سلسلہ ہے۔ ساری عقل اور فہم چپکے سے منفی اثرات بھی قبول کر لیتی ہے، کسی کو معلوم نہیں ہو پاتا۔ سب پر سب کچھ منکشف نہیں ہوتا۔ کبھی اپنا شعور وادراک جو دوسروں سے خود کو برتر ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا کیے ہوا تھا، پتہ بھی نہیں چل

پا تا کہ کب تمام وجود کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ وقت سارے گمان اُلٹ پلٹ دیتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ عورت کتنی ہی ناخواندہ یا احمق ہو مگر مرد کی نظر اور ارادے بھانپ لیتی ہے۔ وہ حساس ہونے کے ساتھ دُور اندیش بھی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں مرد کا اُس سے کوئی تقابل نہیں۔ وقت نے عورت کی ترجیحات پر بھی حملہ کیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے لمس کے معنی سمجھنے کی عمر متعین نہیں ہوتی مگر سمجھ آنے کے بعد جو باتیں سب سے پہلے سمجھ میں آتی ہیں اُس میں مرد کی نظر اور لمس کی معنویت ہے۔ خرد کو اچانک بننے سنورنے کا شوق کیوں کر پیدا ہوا۔۔؟ یہ بات خرم کو بہت بے چین کیے ہوئی تھی۔ کپڑوں کی تراش خراش اور رنگوں میں دلچسپی کا جواز اور محور کیا اور کون ہے؟ وہ بالکل ایسی نہیں تھی۔ تعجب تو اسی بات کا ہے پھر بھی کوئی نوٹس کیوں نہیں کر رہا ہے۔ دیر رات تک موبائل پر سرگوشیوں کے سے انداز میں چھپ چھپا کر سہیلیوں کے نام پر گفتگو بھی کسی کی توجہ نہیں کھینچ رہی ہے۔۔۔ یہ کسی طوفان کے اشارے تو نہیں؟ خرم سوچ رہا تھا کہ کیا اُسے اماں سے بات کرنی چاہیے۔ اگر سچ میں انہیں نہیں معلوم تو اُس کو گوش گزار کرنا چاہیے۔ اماں کیسے چشم پوشی کر سکتی ہیں۔ چوکی پر بیٹھ کر پورے محلے کی خبریں مصلے کے نیچے دبائے رہتی ہیں مگر اپنی جوان بیٹی کے بناؤ سنگھار انہیں کیوں نہیں دکھتے۔؟

ٹی وی کا والیوم کم کر دیا گیا یا بند ہی کر دیا، خرم کو نہیں معلوم مگر آواز بڑھائے جانے کا سبب تو اُسے معلوم تھا۔ چند لمحوں کے بعد خبر ملی کہ شوکت بھائی کا سعودیہ سے فون آیا ہے۔ کمرے میں نیٹ ورک (Net work) کی دقت کی وجہ سے انجم کو باہر آنا پڑا۔ آئندہ ہفتہ کوئی آنے والا تھا۔ سامانوں کی فہرست نوٹ کرائی جا رہی تھی۔ آواز جب زیادہ ہی دھیمی ہوگئی تو خرم کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ اب اُن کے مائیکے کے مطالبے بتائے جا رہے ہوں گے۔ وہ خود ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ حالانکہ اُسے ایک فون کی ضرورت تھی۔ اُس کا موبائل خراب ہو رہا تھا۔ مگر جب شوکت کو اُس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو کچھ خودداری تو اُس کے اندر بھی بچی ہوئی تھی۔ اماں کی چوکی

کی طرف بڑھتے ہوئے فون کے تعلق سے اُسے ایک بات یاد آئی۔ ایک بار اُس نے ابا سے دریافت کیا تھا کہ ''پچھلے زمانوں میں جب فون کی سہولت نہیں تھی تو آپ لوگ اپنے دور رہنے والوں سے کس طرح رابطہ کرتے تھے۔؟''

''ایسے ہی جیسے آج تم کر رہے ہو۔'' ابا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''ایسے۔۔کیسے۔۔میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اُس نے برجستہ اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''بیٹا ہمارے زمانے میں کوئی اپنوں سے اتنی دور رہتا ہی نہیں تھا۔ جسمانی طور پر کوئی کسی مجبوری کے تحت چلا بھی گیا تو ذہنی طور پر وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اُس وقت لوگ اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے جتنے کہ اب ہو گئے ہیں۔ تب ہماری خواہشات اور مطالبے بھی بہت محدود ہوا کرتے تھے۔'' ابا کافی دیر تک ماضی کا ذکر کرتے رہے تھے۔۔۔اُسے یہ بھی یاد تھا کہ ماموں نے آکر بیچ میں خلل ڈال دیا تھا ورنہ وہ جانے کتنی دیر اشرفیوں کی یہ پوٹلی کھولے بیٹھے رہتے۔ ماموں کا خیال آیا تو ذہن اُن کی طرف چلا گیا۔ ماموں بھی کیا ماموں تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ انسانوں کے ساتھ رشتوں کو بھی سمجھنے کی کوششوں میں تھا۔ یہ عام ماموؤں جیسے قطعی نہیں تھے۔ عجیب الخلقت قسم کے آدمی تھے۔ اُن کا اصلی نام کیا تھا یہ خود ماموں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ بتانے والے نے اس معاملے کی وضاحت یوں کی کہ ماموں کو نام بتایا تو گیا تھا مگر وہ یاد نہ رکھ سکے اور نامعلوم لوگوں کی فہرست میں اس طرح اپنا نام درج کروالیا۔ رائے عام تھی کہ کراماً کاتبین کے علاوہ ماموں کا اسمِ گرامی صرف خرم کو معلوم تھا۔ ان کے علاوہ اگر کوئی جانتا بھی ہے تو وہ ابھی تک پردۂ اخفاء میں ہے۔

ماموں کا نام منکشف الحق ہے۔ خرم نے بڑے جتن اور تگ ودو سے نام تو دریافت کر لیا تھا مگر یہ نام کس نے اور کس ضرورت کے تحت رکھا تھا، یہ ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس مشکل اور بھاری بھر کم نام کے بوجھ کو اُٹھانے کی تاب خود ماموں میں

نہیں تھی۔

محبوبہ کے بچے جسے ماموں کہتے اور پکارتے ہیں، اُس ذی روح کے لیے اس تخاطب میں جو مضحکہ خیزی ہے اُس کا تو صرف لطف ہی لیا جا سکتا ہے۔ لفظ ماموں سب کی زبانوں پر ایسا چڑھا کہ جن کے وہ چچا یا خالو وغیرہ تھے، وہ سب بھی ہمہ وقت ماموں کی گردان لگائے رہتے۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئے کہ ماموں کو اپنے اصل نام کی ضرورت درپیش آئی۔ ظاہر ہے یہ اُن کے لیے سخت آزمائش کا مرحلہ تھا۔ ماموں نے کبھی یاد کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مسئلہ تو اُس سرکاری اہلکار یا دفتری کا ہوتا، جنہیں اُن کا نام مطلوب ہوتا۔ اُس کے سامنے ایک مشکل یہ اور ہوتی کہ وہ اپنے افسر کو کیسے یقین دلائے گا کہ صاحبِ معاملہ کو اپنا نام ہی نہیں معلوم۔ انہیں تو خود یقین کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ شناختی کارڈ پر کبھی کوئی پڑھنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو وہ کوئی اور نیا نام نکل آتا۔ ماموں کے اندر انکسار اتنا تھا کہ براہ راست انکار بھی نہیں کر پاتے۔ زیرِ لب مسکرا دیتے یا خجالت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ تھوڑی ترمیم کے ساتھ نئے ناموں کو سُن کر وہ کچھ مشکوک سے ہو جاتے۔ انہیں سب کے سب دُرست لگتے مگر اگلے لمحے خود ہی اس کی نفی کرتے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟

وقت کے ساتھ ماموں کے نام کا سِکّہ ایسا چلا کہ اور تو اور اُن کی منکوحہ کلثوم بیگم بھی بعض اوقات اُسے خرچ کرنے سے گریز یا تکلف نہیں کر پاتیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ماموں بہت سادہ لوح اور شریف النفس واقع ہوئے تھے۔ ارزاں بھی اتنے کہ جو چاہتا، آواز دے کر بُلا لیتا۔ ماموں کے اندر انکار کی جسارت نہیں تھی۔ لہٰذا ہر صدا پر لبیک کہتے اور مؤدب کھڑے ہو جاتے۔ ہاتھ پر پیسے دھر کے اگلے احکامات جاری ہوتے کہ ذرا گوشت، قیمہ لا دیں یا بنیے کی دُکان سے کوئی سودا۔ دھنیا، پودینہ کے لیے بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بیشتر بچے ہوئے پیسے ماموں سے واپس نہیں لیے جاتے۔ کبھی پیسے نہیں بچتے تو انہیں الگ سے دیے جاتے۔ لوگ ماموں سے محبت کرتے تھے اور یہ بات انہیں

بہت اچھی طرح معلوم تھی۔ کوئی ماموں سے اگر یہ کہہ دیتا کہ یہ پیسے لیں اور فلاں جگہ سے یہ پکڑ لیں۔'' اس پر ماموں خفا ہو جاتے مگر اُس کا اظہار واپس آنے پر کرتے۔

''میاں۔۔۔یہ پکڑ۔۔۔لیں۔۔۔کا کیا مطلب ہے، اور یہ کون سی زبان ہے۔؟'' چہرے پر اتنی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہتے کہ لگتا کہ کوئی بڑا مفکر یا ماہر زبان مخاطب ہے۔ جو لوگ اُن سے بہت اچھی طرح واقف تھے کئی بار وہ بھی ٹھٹھک جاتے۔

آئے دن ماموں پر کسی نہ کسی طرح کے دورے پڑتے۔ یہ بیماری، آزاری والے دورے نہیں ہوتے، بس اچانک کوئی لت لگ جاتی۔ کسی بات کا خبط ہو جاتا اور پھر مہینوں اُسی کے سحر میں گرفتار و فا رہتے بلکہ خود تو کم رہتے دوسروں کو امتحان میں زیادہ ڈالے رہتے۔ جس چیز کی دُھن سوار ہو جائے پھر آسانی سے دوسرے موضوع پر بات نہیں کرتے، جب تک از خود بھوت اُتر نہیں جاتا۔ کبھی شکاریات کا چسکا لگ جاتا تو کبھی کسی کھیل کا۔ کبھی پتنگ بازی تو کبھی پالتو جانوروں کا۔ کبھی حکمت پر چشم التفات ٹھہر جاتی تو کبھی شعر و ادب بھی زد میں آجاتے۔ جس چیز کو بھی خود پر طاری کرتے، یہ جانچ پڑتال ضرور کر لیتے کہ مبادا اس کے بارے میں نہیں کچھ معلوم تو نہیں ہے۔ اگر تھوڑی بہت ہی جانکاری ہوتی تو اُدھر سے فوراً آنکھیں پھیر لیتے، اس کے بعد دعویٰ کا لُطف نہیں بہت گرویدہ کرتا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اتنے سنجیدہ تو وہ اور کسی معاملے میں کبھی نہیں دکھتے۔ ماموں کی قربت میں سب کا جی لگا رہتا تھا۔

ان دنوں ماموں پر کرکٹ کا جن سوار تھا۔ یہ تو ہونا بھی تھا۔ ورلڈ کپ کھیلا جا رہا تھا۔ جسے دیکھو کرکٹ میں لگا ہوا ہے۔ ماموں کو سبکی سی لگی پھر جب یہ یاد آیا کہ انہیں مُوے اس کرکٹ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ بس اتنا کافی تھا۔ اپنے بچوں سے ضرورت بھر کی معلومات حاصل کی اور انہیں تاکید بھی کی کہ یہ میرے اور ان کے بیچ راز رہے گا۔ اس کی بھنک کسی کو نہیں ہونی چاہئے۔ بیٹے نے یہ انکشاف بھی کیا کہ کل انڈیا کا مقابلہ پڑوسی ملک کی ٹیم سے ہے، یہ سب سے بڑا میچ ہے۔

''کیوں۔۔؟'' ماموں نے صرف اتنا ہی پوچھا تھا مگر بیٹے کو سمجھانے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ انھوں نے ایک بات گرہ سے باندھ لی کہ جیتنے والا ہارنے والے سے بہتر ہوتا ہے۔ اب تمام توجہ اور دلچسپی شکست و فتح پر منحصر تھی۔

ماموں باریش بھی تھے۔ سر سے ٹوپی سوتے وقت بھی نہیں اُتارتے حالاں کہ صبح جب چارپائی کے نیچے تلاش کرتے تو ساتھ میں یہ عہد بھی کرتے کہ آج سے اُتار کر رکھ دیا کریں گے۔ سوتے وقت یہ تو یاد آتا کہ کچھ اُتارنے کی قسم کھائی ہے مگر وہ چیز یاد نہیں آتی حتیٰ کہ نیند آ جاتی۔ حُلیے سے اُن کے مذہبی تعلق کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جیسے نظر آتے تھے کچھ معاملات کو چھوڑ کر ویسے نہیں تھے۔ سال میں صرف تین نمازیں پڑھتے تھے۔ عیدین اور جمعۃ الوداع۔ کسی جنازے کی اگر پڑھنی پڑ جائے تو خود کو سخت مشکل میں پاتے۔ تکبیروں کا حساب اُن کے ذہن میں محفوظ نہیں رہ پاتا۔ اس لیے وہ رُکوع میں چلے جاتے۔ آنکھ کے کونوں سے دائیں بائیں کا جائزہ لیتے اور خجل ہوتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ ایک بار تو جی میں آیا کہ نکل بھاگیں مگر جانے بھر کی گنجائش نہیں تھی۔ ورنہ یہ قدم تو کبھی اُٹھ گیا ہوتا۔ گو کہ آخری لمحہ تک کوشش یہی رہتی کہ صف بندی میں نہ شامل ہو پائیں مگر عین وقت پر کوئی نہ کوئی ٹوک دیتا اور ماموں کو سپر ڈالنی پڑتی۔ سلام پھیرنے تک ہم زاد کو دلاسہ دیتے رہتے کہ میری نیت تو نہیں تھی۔ تُو تو جانتا ہے اور اللہ صرف نیت دیکھتا ہے۔

ماموں کا بڑا بیٹا فرقان ٹی وی پر میچ دیکھ رہا تھا۔ بہت سنجیدگی سے اُس کے برابر میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک فرقان سے بھی زیادہ توجہ اور انہماک کا مظاہرہ کیا پھر بول ہی پڑے۔ ''کیوں میاں۔۔۔۔ کتنے چکر۔۔۔۔ ہو گئے۔؟''

''چکر۔۔؟'' اُس نے اپنی تمام حیرت یکجا کرتے ہوئے پوچھا۔ چکر کسے کہہ رہے ہیں۔'' وہ اپنے باپ کی بات کا مقصد سمجھ گیا تھا وضاحت بھی انہیں سے درکار تھی۔

''ارے میاں۔۔۔۔ یہ جو دوڑ لگا کر ایک دوسرے کے پاس سے بنا حال احوال

لیے گزر جاتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی۔۔۔؟''

''ابا اسے رَن (RUN) کہتے ہیں۔ جتنے چکر اتنے رَن اور جو زیادہ رن بنائے گا وہی جیتے گا۔

''اچھا تو۔۔ یہ معاملہ ہے۔۔۔ کس کے کتنے ہو گئے۔۔؟''

''کیا کتنے ہو گئے۔۔؟ فرقان نے سوال کے جواب میں سوال داغا۔

''وہی۔۔ جو تم ابھی بتا رہے تھے۔۔''

''رَن۔۔(RUN)۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ اور کون جیت رہا ہے؟''

''ابا، ابھی دس منٹ ہوئے ہیں میچ شروع ہوئے۔ ابھی جیت، ہار کا فیصلہ کہاں معلوم ہوگا۔'' فرقان اب باپ کی موجودگی سے بور ہو رہا تھا۔

''میاں کچھ پتہ وتہ بھی ہے اس کھیل کے بارے میں یا بس یوں ہی لن ترانیاں ہانکتے ہو۔۔۔''

''امّاں انہیں یہاں سے بلائیے۔'' فرقان نے والدہ سے مدد مانگی۔ کلثوم بیگم نے جمعہ کی نماز کے لیے پکار لگا دی جبکہ انہیں معلوم تھا کہ پڑھنا نہیں ہے مگر وہ اپنی ذمے داری سے کیسے پیچھے ہٹ جاتیں، آخر انہیں بھی اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ پھر کب کس کو توبہ کا موقع مل جائے، یہ کس کو معلوم ہے؟ بیوی کی پکار سُنی ان سُنی کر دی۔ دوبارہ صدا آئی۔ آپ کی ٹیم ایسے نہیں جیتنے والی۔ کم سے کم اُسی کے لیے ایک بار چلے جائیں۔ شائد آپ کی دعا ٹیم کی فتح کا سبب بن جائے۔'' یہ بات ماموں کے جی کو لگ گئی۔ ایک لمحہ کو بھی یہ نہیں سوچا کہ جمعہ کی نماز کا کچھ اہتمام بھی ہوتا ہے۔ اور تو اور پاکی، ناپاکی کی طرف بھی دھیان نہیں گیا۔ ٹوپی سر پہ پہلے سے ہی رکھی تھی۔ دروازے کی طرف لپکے۔ پردہ اُٹھا کر یہ جا اور وہ جا باہر نکل کر انہیں معلوم ہوا کہ ابھی نماز میں کافی دیر ہے گھر واپس آنے کا ارادہ ترک کر کے یہاں وہاں وقت ضائع کرنے لگے۔

آخر کار وقت ہوگیا اور تیز قدموں سے مسجد کی طرف بڑھے جارہے تھے۔ چند لمحوں میں مسجد میں داخل ہوگئے۔ وضو خانے میں پٹڑی پر بیٹھے ہی تھے کہ خیال آیا کہ اُن کی ٹیم کون سی ہے؟ یہ بات تو فرقان سے پوچھی نہیں۔ اُس کی اماں کو بھی توفیق نہیں ہوئی کہ بتا دیتی۔ دل نے ایک بار پھر گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔ وضو کے نام پر کسی طرح ہاتھ، مُنھ بھگوئے اور نماز کے لیے اندر چلے گئے۔ ماموں کو معلوم تھا کہ میچ آخری مرحلے میں ہے۔ جب تک اُن کی گھر واپسی ہوگی شائد نتیجہ بھی آ چکا ہوگا۔ وہ خود نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اتنی زیادہ فکر کیوں ہو رہی ہے۔ معاً اُن کے ذہن میں ایک بات آئی کہ وہ اس وقت مسجد میں مناسب جگہ پر نہیں ہیں۔ یہاں بھیڑ کی وجہ سے نکلنے میں خاصی دشواری کے ساتھ وقت بھی لگے گا۔ خاموشی سے اُٹھ کر سب سے پچھلی صف میں دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر پہلے جائزہ لے کر مطمئن ہوئے، پھر بیٹھ گئے۔ امام صاحب کا بیان جاری تھا۔ ماموں کی ساری توجہ میدان پر تھی۔ پتہ نہیں کس بات یا منظر نے اتنی جگہ بنالی تھی جس کا علم انہیں بھی نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کے جیتنے پر خوش ہونا ہے اور کس کے جیتنے پر افسردہ، مگر لاشعوری طور پر یہ لگ رہا تھا کہ ہاری ہوئی ٹیم کو اُن سے منسوب کر کے، اُن کا مذاق اُڑایا جائے گا۔

اللہ اللہ کر کے جماعت کھڑی ہوئی۔ پہلی رکعت میں امام صاحب نے قرأت کے ساتھ لمبی سورت کی تلاوت کر دی۔ ماموں کے سارے کس وبَل نکل گئے۔ اتنی بے چینی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ شائد اسی بات کے لیے زیادہ فکر مند بھی تھے۔ آخر کار وہ وقت بھی آیا جب امام صاحب نے سلام پھیرا۔ ماموں نے سلام پھیرتے وقت اپنے دونوں جانب کا بغور جائزہ لے لیا تھا۔ اُن کے دائیں طرف کلّو نائی بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ اندھے کو کیا چاہیے۔۔۔ دو آنکھیں۔۔۔ کلّو کو بھی کرکٹ کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ محلّے میں یہ خبر عام تھی کہ کلّو نے بال کاٹنے کے لیے دکان آمدنی کے لیے نہیں میچ دیکھنے کے لیے کھولی تھی۔ میچ کے دوران دُکان شائقین سے بھری رہتی۔ ایک دو جو حجامت کر غرض سے

آتے بھی تو وہ اپنا مقصد بھول کر کرکٹ دیکھنے میں محو ہو جاتے۔ ماموں اپنا منہ کلّو کے کان کے پاس لے گئے۔ سرگوشی کے سے انداز میں استفسار کیا۔ ''اماں ۔۔۔ میچ کا کیا ہوا۔ کون جیتا۔۔؟'' کلّو، ماموں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، اس کے باوجود اُس کے چہرے پر تحیر تھا۔ چند لمحہ اُس نے کچھ سوچا پھر ماموں کے ہی انداز میں اُن کے کان میں بہت آہستگی سے کہا۔۔۔ ''شیطان ۔۔ ماموں ۔۔۔ آج تو شیطان جیت گیا۔'' ماموں اتنے باریک اشارے سمجھنے پر قادر نہیں تھے۔ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائے۔ لاحول ولاقوۃ ۔۔۔ آج ۔۔۔ جمعہ کے دن بھی ۔۔۔'' ماموں کا جی اتنا کھٹا ہو گیا تھا کہ پھر دُعا کے انتظار کے بغیر کودتے پھاندتے مسجد سے باہر آ گئے۔

اُن کی نظر میں خرم ہی اکیلا تھا جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ اُن کا مذاق نہیں اُڑاتا ہے اس لیے اپنے تمام راز و نیاز کی باتیں اسی سے کرتے ہیں۔ رائے مشورے کے لیے بھی خرم سے زیادہ اُن کے لیے کوئی معتبر نہیں تھا۔ ماموں نے باہر آ کر کچھ دیر ٹھہر کر خرم کا انتظار کیا اور نکلتے ہی اُسے اُچک لیا۔ پورا قصہ سنانے کے بعد اُس کی طرف اس اُمید سے دیکھا کہ وہ اس کی تعریف کرے گا مگر یہ انہیں بھی نہیں معلوم تھا کہ تعریف کرے گا بھی تو کس بات کی ۔۔۔؟ ان تمام باتوں سے بے نیاز خرم ماموں کو غور سے دیکھے جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اور کب تک دیکھنے کو ملیں گے ماموں جیسے ۔۔ لوگ اتنے سادہ ۔۔۔ اور بے ضرر ۔۔۔ مکر و فریب سے عاری ۔۔ نفع و نقصان سے بے نیاز ۔۔ کسی کا بھی بُرا نہیں چاہنے والے ۔۔۔ پچھلے موسموں کی بہار جیسے ہیں ماموں منکشف الحق ۔۔۔ اس کے بعد پیدا بھی ہوں گے یا نہیں ۔۔۔ کسی بشر کو نہیں معلوم ۔۔۔؟ کیا یہ صرف قصہ کہانیوں میں ہی رہ جائیں گے ۔۔۔۔ اور یہ قصے کہانیاں بھی آنے والی نسلوں کے لیے کس قدر دلچسپی کا باعث ہوں گی ۔۔۔ یہ بات بھی زمین پر کس ذی روح کو معلوم ہے ۔۔۔؟

●●●

زندگی کاایک اور دن آج بھی کسی خارجی تبدیلی کے بغیر گزر گیا۔ گزر اس لیے گیا کہ وقت ساکت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اچھا وقت جلدی گزر جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو بھی۔ خرم کا خیال تھا کہ وقت کیسا بھی ہو، اب تیزی سے ہی گزرتا ہے۔ پہلے ایک عید سے دوسری عید تک ایک برس کا عرصہ بہت طویل معلوم ہوتا تھا پر اب تو جیسے وقت کے بھی موٹر لگ گئی ہے۔ رفتار اکثر حیرت میں ڈالتی رہتی ہے۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ وقت کی برکت بھی ختم ہو گئی۔

ابھی کتنے دن پہلے کی بات ہے جب وقت کو بہت فرصت تھی اور وہ خرم کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتا تھا مگر پھر وقت کی دوڑ رہی ہوئی جس میں خرم بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ اب تو اُس کے نشانات بھی باقی نہیں رہے۔ دن بڑی خاموشی سے رات میں مدغم ہو گیا۔ شب سے خرم کے کچھ اور ہی معاملات تھے ہر چند کہ اختلاف یہاں بھی تھا۔ اُسے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

وہ کھلے آسمان کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اُس روز طبیعت کچھ زیادہ ہی اُداس تھی۔ وہ رونا چاہ رہا تھا۔ خواہش ہوئی کہ خوب زور زور سے روئے مگر رونا کسی خواہش کے تابع بھی تو نہیں۔ بہت آواز کے ساتھ رولوں مگر کوئی سُننے والا نہ ہو۔ اُسے یاد تھا کہ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس قدر مایوسی کا احساس کبھی کبھی ہوتا ہے۔۔۔ کسی سے بات کرنے کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ آج پھر ویسا ہی کچھ لگ رہا تھا۔ صبح سے اُس پر ویرانی سی طاری تھی۔ نہ کچھ کھانے پینے کی خواہش، نہ کسی سے ملنے کی۔۔۔ خلوت بھی ایسی ہو کہ رونے کی آواز بھی کسی کو سنائی نہ دے۔ وہ کیوں رونا چاہتا ہے، یہ بات خود کو بتانی بھی نہ پڑے۔ آج بھی اُس کی آنکھوں میں جلن تھی۔ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا مگر نیند کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ دیر تک آنکھیں بند کر ذہن میں چل رہی ہواؤں کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ وحشت و بے زاری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ نڈھال سا ہو گیا تھا پھر اچانک پتہ نہیں کیا سوچ کر ایک دم سیدھے ہو کر لیٹ گیا۔ آنکھیں بھی اس طرح

کھول دیں جیسے ٹیوب لائٹ کم وولٹیج میں جل بجھ کر ایک بار پھر سے چمک کر جل اُٹھے۔

رات اپنا گہرا سیاہ اُداس دامن پھیلائے ایک بار پھر اُس کے سامنے سر جھکائے مضمحل، افسردہ سی کھڑی تھی۔ جہاں تک اس کی نظر جا سکتی تھی، رات کے نام پر سیاہ ہیبت چاروں سمت طاری تھی۔ آسمان کی وسعتیں اور رات کے اسرار بھی تحیر میں اضافہ کر رہے تھے۔ ٹرین کی آواز سکوت کو توڑتی ہوئی گزری۔ سب سے قریب ریلوے کراسنگ بھی یہاں سے خاصی دور تھی مگر رات میں آوازوں کی طاقت اور معنویت میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو جاتا ہے۔ دن میں خلقت کا شور، ریل کی اس بہت تیز آواز کو بھی دھیما کر دیتا ہے۔ خرم نے وقت کا اندازہ لگایا۔ گمان تھا کہ بارہ کے آس پاس ہوگا۔ تصدیق کے لیے تکیہ کے نیچے سے موبائل نکالا۔ اُس کا خیال درست تھا۔ دس منٹ پہلے بارہ بج چکا تھا۔ دھیان انترا کی طرف گیا وہ سو گئی ہوگی۔ اُس نے سوچا۔ ایک گھنٹہ پہلے گڈ نائٹ Good Night کا میسج آ چکا تھا۔ اُس نے جواب دیا تو وہ پہنچا نہیں۔ وہ سونے سے پہلے نیٹ بند کر دیتی ہے۔ یہ بات خرم کو معلوم ہے اسی بات سے اُس نے انترا کے سونے کا اندازہ لگایا تھا۔ ویسے بھی وہ جلدی سو جاتی تھی امتحان کے دنوں میں بھی زیادہ دیر تک نہیں جاگ پاتی تھی۔ البتہ صبح چاہے جتنے بجے اُٹھا دو۔ ایک آواز میں بستر چھوڑ دیتی۔ اب انترا کے تعلق سے باتیں یاد آتی جا رہی تھیں۔ ممکن ہے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ ممکن تو یہ بھی ہے کہ خواب میں اُسی کو دیکھ رہی ہو۔؟

اس سوال کے فوراً بعد دوسرا سوال کہ وہ اُس پر کیوں جان چھڑکتی ہے؟ یہ سوال اگرچہ اُسے پہلے بھی پریشان کرتا رہا ہے مگر بھی ذہن سے چپک ہی جاتا ہے۔ ایسا کیا ہے اُس کے پاس۔۔۔ کہ انترا جیسی لڑکی اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ ایک اچھے اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ وہ لوگ بہت تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ شکل وصورت کے معاملے میں بھی وہ عام لڑکیوں میں شمار نہیں ہوتی۔ سب سے زیادہ حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ دونوں الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات اب

تو اتنی معمولی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب اُن دونوں میں قربت ہوئی تب صورت حال یہ نہیں تھی مگر اب تو بہت کچھ سوچنا ہوتا ہے۔ کسی نظریے کی تائید یا تردید سے قطع نظر خود کو اس سے الگ رکھنے کا بھی سوال قائم ہوتا ہے۔ خطرات سے خود کو بچانے کے ساتھ لڑکی ہونے کی وجہ سے سماج میں عزت اور وقار سے چشم پوشی بھی کوئی کیسے اختیار کر سکتا ہے۔؟" خرم کا ذہن اس طرح کے سوالات قائم کر رہا تھا اب جواب دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بڑوں کے منہ سے سُنا ہے اور کتابوں میں اُس نے خود پڑھا ہے کہ محبت تمام نفع ونقصان سے ماورا ہے۔ وہ کسی کو کسی سے ہو سکتی ہے۔ محبت اور عبادت تو بس کی جاتی ہے کسی سے بتائی تھوڑی جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر اعتبار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں۔ دونوں میں بلا کا صبر بھی ہے۔ کبھی جذبے مشتعل بھی ہوتے ہیں تو انہیں قابو کرنے کا طریقہ معلوم ہے۔ ذہنی ہم آہنگی بھی مزے کی ہے۔ زندگی کے اصول وضوابط اور قدروں کے تحفظ کے لیے دونوں کی سوچ کا محور ایک جیسا تھا اور اس رشتے کی بنیاد اُسی پر ٹکی تھی۔ کروٹ لیتے ہوئے اُسے احساس ہوا کہ بے چینی میں کچھ کمی آئی ہے۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ اب چند لمحوں میں سو بھی جائے گا اور تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اُس کا فون نہیں تھا۔ یہ آواز نیچے سے آئی تھی۔ ایک چھوٹی سی جالی لگی ہونے کی وجہ سے نیچے کی آہٹیں بھی اُوپر محسوس ہوتی تھیں۔ اتنی رات گئے اگر فون رانگ نمبر نہیں ہے تو کسی اچھی خبر کے امکان تو نہیں ہیں۔ خرم کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ نامعلوم سے اندیشے گھیرنے لگے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانے کیوں لگا کہ نیچے سے اُس کے لیے آواز آنے ہی والی ہے اور تبھی خرد نے پکار لگائی۔۔۔ "خرم بھائی جلدی نیچے آیئے۔" سانسوں کا توازن اور زیادہ منتشر ہو گیا۔ اُسے لگا جیسے ایک جست میں زینہ اُتر گیا ہو۔ اگلے ہی لمحہ وہ نیچے کمرے میں تھا۔ پُوچھنے سے پہلے ہی خرد نے بتایا کہ بھائی جان کا انتقال ہو گیا ہے۔" انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔۔" یہ تو برجستہ نکل ہی جاتا ہے۔ بھائی جان سے مُراد اُس کے چچا جن کا نام شبیر تھا مگر اُن کی آل اولادیں بھائی جان کہتی

تھیں۔ خرم اماں کی چوکی کے پاس بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بقیہ لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ ابا پر ایک دم سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ کسی عزیز کی موت پر دھاڑیں مار مار کر رونا ہی رنج و غم کے اظہار کی دلیل نہیں بلکہ رونے پر ضبط کر لینا، رو لینے سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ اب اکثر لوگوں کے لیے رونے سے زیادہ روتا ہوا نظر آنا ضروری ہے۔ اب اداکاری کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔ جو جتنا بہتر اداکار، اتنا کامیاب۔ شخصیت کو ناپنے کا یہی پیمانہ بچا ہے۔ خرم کو بہر حال ابھی تک اداکاری نہیں آئی تھی۔ وہ تو اُن لوگوں کا دُکھ بھی اپنا سمجھ لیتا تھا جن سے اُس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو اُس کے سگے اور بہت خاص چچا تھے۔ رشتے تو نام کے لیے بھی ہوتے ہیں، اصل تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ شبیر چچا سے اُس کے معاملات اور طرح کے تھے۔ وہ بھائی جان کی موت پر گہرے صدمے میں تھا۔ آہ وفغاں سے اُسے کسی کے سامنے کچھ ثابت نہیں کرنا تھا۔ لاشعور میں کہیں یہ بات اُس کے لیے راحت بخش بھی تھی کہ اللہ کا یہ فیصلہ اُن کے حق میں بہتر ہوا۔ اس کے باوجود اُن کا یوں چلا جانا ناقابلِ تلافی خسارہ تھا۔ کبھی کبھی ایک غلط فیصلہ زندگی کا ڈھب تبدیل کر دیتا ہے۔ بعض غلطیوں کی بھرپائی نہیں ہو پاتی ہے۔ اتنے مضبوط ارادوں والا شخص جانے کس گھڑی کیوں کر اتنا کمزور ہو گیا کہ وہ غلطی سرزد کر بیٹھا، جس کا تاوان ادا کرنے کے لیے خود کو قربان کرنا پڑا۔

ذرا سی دیر میں گھر میں افراتفری مچ گئی۔ رات کے اس پہر میں کس کو جانا ہے ۔۔۔ کیسے جانا ہے؟۔ اس پر مشورہ ہونے لگا۔ بچے سو رہے تھے۔ اُنہیں اُٹھایا جائے کہ نہیں ۔۔۔ لوگ تذبذب میں تھے مگر اماں نے فیصلہ کر دیا کہ تم لوگ ابھی چلے جاؤ۔ ہم اور ابا تھوڑا ٹھہر کر خرد کے ساتھ کیب بُک کرا کے آ جائیں گے۔ ابا بولے ''میں بھی فوراً جاؤں گا ۔۔۔'' اماں معاملے کی نزاکت بھانپتے ہوئے بولیں کہ تو پھر ٹھیک ہے ہم سب بھی چلتے ہیں۔ دوا کی ایک خوراک کھا لیں اور باقی رکھ بھی لیں۔ وہاں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ خرد تم دس منٹ بعد کیب (Cab) بُک کر دینا۔

تھوڑی دیر بعد طے شدہ پروگرام کے تحت وہ لوگ باہر نکل آئے۔ بچوں کی آنکھوں پر ابھی بھی نیند سوار تھی۔ خرم بڑے بھائی سکندر کے ساتھ بائک پر بیٹھ گیا باقی لوگ کیب میں سوار ہو گئے۔ خاموشی تھی یا شبیر کا تذکرہ۔۔۔ رات میں سڑکوں کا یہ سناٹا عام طور سے ہراساں کرتا ہے مگر آج اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کم وقت میں یہ لوگ بھائی جان کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔

رات کسی نے مورنگ ٹرک پر سے اُتروائی تھی جس کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا اور گاڑی دروازے تک نہیں پہنچ سکی۔ اسی لیے ان لوگوں کو سڑک پر تھوڑا پہلے ہی اُترنا پڑا۔ نصف شب کے بعد عام طور سے شہر کی اکثر شاہراہوں پر آوارہ کتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔ کتوں کے ساتھ آوارہ کی ضرورت یوں پیش آئی کہ بہت سے کتے اس خوبی سے محروم بھی رہتے ہیں۔ مین روڈ سے جب وہ لوگ اندروالی سڑک پر مڑے تو کتوں کا ایک جھنڈ جانے کہاں سے نکل کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لیے کوئی بھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ چوں کہ وہ پہلے سے نہیں دکھے تھے اور اچانک نمودار ہوئے تھے۔ خرم کو معلوم تھا کہ رات میں یہ اپنے علاقوں کی غیر مشروط حد بندی کرتے ہیں۔ ان کی حد یہ اندروالی سڑک ہے۔ کتوں کی گھبھکی سے اگر ڈر گئے تو یہ حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ بھاگنے کے بجائے آپ اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں تو چند لمحوں میں ان کی سرکشی کے ساتھ بھونکنے کی آواز بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہ باتیں خرم نے سب کو بتا دی تھیں۔ وہ سڑک پر بائک سے اُتر کر ان لوگوں کے ساتھ ہو لیا تھا۔ ایسے وقت میں اپنی جگہ پر کھڑے رہنا، اس شرط کے ساتھ کہ خوف دکھائی نہ دے اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ بہر حال خرم نے آگے بڑھ کر مورچہ سنبھالا۔ وہی نتیجہ اخذ ہوا جو اُس نے بتایا تھا۔ خرد کچھ زیادہ ڈر گئی تھی۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی رات بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ کچھ لوگ تو صرف رات کی تاریکی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

خرم کی نظر پاس میں ایک ٹٹر پر پڑی تھی۔ اُسے لگا کہ اس میں سے ایک لکڑی نکل

سکتی ہے۔ بہت پھرتی سے لپک کر اُس نے بانس نما لکڑی گھسیٹی۔ وہ پورا بانس تھا جو سرا تا ہوا اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ کُتے ایک دم سے پیچھے سرکے اور منتشر ہونے لگے۔ خرم نے زور سے زمین پر پٹکا اور وہ سب کے سب اِدھر اُدھر بھاگ گے۔ طاقتور ہونا بھی کیا لُطف دیتا ہے۔ خواہ کتوں سے دفاع کے لیے ایک معمولی سے ڈنڈے کی ہی شکل میں کیوں نہ حاصل ہوا ہو۔

چند لمحوں بعد وہ سب بھائی جان یعنی شبیر چچا کے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کے باہر تک گریہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُن کے قدم رکھتے ہی شور ایک دم سے تیز ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر تیز آواز میں رونے لگے۔ اب تک خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ قریب رہنے والے عزیز اور پڑوسی پہلے سے ہی موجود تھے۔ رونے کی آوازیں تھوڑی دیر میں کمزور ہونے لگتیں اور کسی کے آ جانے سے اچانک یہ بَین تیز ہو جاتا۔ خاصی دیر سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ خرم کو دہاڑیں مار کر رونے کی عادت نہیں تھی۔ یہ سب خود طے کرنے سے ہوتا بھی نہیں ہے۔ رونے پر قابو کی بھی حد متعین ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ صبر وضبط زیادہ ہے آنکھ سے آنسو بھی نہیں ٹپکے گا۔ آج بھی بار بار آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ احتیاط سے آنکھیں صاف کر لیتا بلکہ رومال ہاتھ میں ہی رکھ لیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد گریہ وزاری کا شور کچھ کم ہوا۔ لوگ تھک بھی رہے تھے۔ نیند کا غلبہ بھی طاری تھا۔ حالاں کہ کئی لوگ جنہیں یہاں ہونا چاہیے تھا وہ نہیں تھے۔ کچھ آئے تھے، تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے گئے۔ کچھ بہت قریبی لوگ تھے جو نصف رات میں آنے کی صعوبت برداشت نہیں کر سکے۔ بات صرف جذبے اور تعلق ثابت کرنے کی ہی تو نہیں ہے، بے حسی کہاں سے اور کیسے لائی جاتی ہے۔ نوٹس سب کرتے ہیں۔ کچھ زبان سے اظہار کر دیتے ہیں اور بقیہ خاموشی سے تماشا دیکھتے ہیں۔ تسلی اور تشفی کا دور بھی شروع ہو گیا۔ وقت بغیر کاٹے بھی کٹ جاتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے رات گزر گئی۔ فجر کی اذانیں گونجنے لگیں۔ خرم جب سے آیا تھا۔ بھائی جان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں بے

تحاشا نیند بھری تھی مگر سونے کا موقع تھا اور نہ مخل پانی کے چھینٹے مارنے کا ارادہ تھا مگر اب تو وضو کا وقت ہو گیا۔ وہ اُٹھ کر مسجد کی طرف چل دیا۔ جیب سے ٹوپی نکال کر سر پر رکھ لی۔

فجر کے بعد آنے والوں کا تانتا سا لگ گیا۔ گھر کے بڑے اور ذمے دار یکجا ہوئے تو سب سے پہلے تدفین کے وقت کا اعلان ہونا تھا۔ نماز کے فوراً بعد وہ سب ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ ظہر بعد تدفین پر اتفاق رائے ہو گیا اور فوراً مسجد سے اعلان بھی کروا دیا گیا۔ دو لوگوں کو قبر کی ذمے داری سونپی گئی۔ دو اور لوگوں کو کفن اور کچھ دیگر سامان کے لیے روانہ کیا گیا۔ موبائل پر مٹی اُٹھنے کی خبریں ایک دوسرے تک پہنچانے کا کام بھی شروع ہو گیا۔

اب بجلی سے چلنے والے ایسے پلنگ بھی دستیاب ہیں جو مُردے کے لیے فریج کا کام کرتے ہیں۔ چوں کہ سخت گرمی کا موسم ہے اسی لیے دوپہر تک جنازے پر منفی اثرات کے امکان بہت زیادہ تھے۔ اس محلے کی مسجد اکبری مسجد کے نام سے مشہور تھی اور اسی میں پلنگ کا ہدیہ بھائی جان یعنی شبیر چچا نے ہی کیا تھا۔ کس کو معلوم تھا کہ اتنی جلدی وہ خود ہی استعمال کر لیں گے۔ گھر والوں نے وہ الیکٹرک بیڈ (Electric bed) رات میں ہی مسجد سے منگوا لیا تھا۔ بھائی جان کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا۔ اس لیے تعزیت میں زیادہ لوگوں کے آنے کی اُمید تھی۔ ذرا ہی دیر میں ٹینٹ اور کرسیاں بھی آ گئیں۔ ٹھنڈے پانی کے لیے واٹر کولر بھی رکھوا دیے گئے۔ خرم بھی انتظامی اُمور میں لگ گیا تھا۔ کرنے والے ہاتھ زیادہ تھے تو ذرا دیر میں ہی یہ سب بھی ہو گیا۔ ابھی دھوپ تیز نہیں ہوئی تھی اس لیے پنکھوں سے گرم ہوائیں نکل رہی تھی۔ خرم باہر تمبو کے نیچے بیٹھ گیا۔ لوگوں کے آنے کا سلسلہ لگاتار بڑھ رہا تھا آنے والی گاڑیوں کے لیے جگہ بنوا دی گئی تھی۔ سڑک پر پڑی مورنگ بغیر کہے صاف کروا دی گئی تھی۔ اسے پیاس لگی تو واٹر کولر سے پانی پیا اور پھر جانے کیا سوچ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ بھائی جان گہری اور کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند میں سو رہے تھے۔ ابّا یعنی احمد معید اُن کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ ابّا کے چہرے

سے لگ رہا تھا کہ خوب روئے ہیں۔ سانسیں بھی اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ کتنے تو عارضے لگے ہوئے تھے۔ پرانے زمانے کے کھائے پیے تھے جواب تک چل رہے تھے ورنہ کون جانے کب کھاٹ سے لگ گئے ہوتے۔

بھائی جان کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آ رہا تھا۔ ایسا سکون جس کی تلاش میں اہل خانہ بہت دنوں سے خاصہ فکر مند تھے۔ نجات کی تدابیر بھی کی جارہی تھیں مگر یہ کسے معلوم تھا کہ بھائی جان کو راحت وسکون اپنی جان کے عوض حاصل ہو پائے گی۔ خرم نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ''تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہو گئے۔؟''

''کیا پچھلے ڈیڑھ سال میں جو کچھ ہوا۔ اگر وہ نہیں ہوا ہوتا تو شبیر احمد زندہ ہوتے''۔؟ ایک عجیب اور غیر متوقع سوال خرم کے ذہن میں آیا۔ وہ مزید سوچتا ہے کہ کیا یہ سچ میں ایک فطری موت ہے۔؟'' اور پھر سوال در سوال اس کے سامنے آنے لگے۔ پورا منظر نامہ اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگا۔ بہت سی باتوں اور واقعات کا وہ خود بھی گواہ تھا۔ اُس کی کوئی ترتیب ذہن میں نہیں تھی مگر یاد اُسے سب کچھ تھا۔ وہ یادوں کے تعاقب میں اُن کے پیچھے ہو گیا۔

خرم کو یاد آتا ہے وہ زمانہ جب وہ لوگ بھی یہیں اپنے ددیہال میں رہتے تھے گو کہ اُس کی پیدائش کے بعد اُس کے والدین یہاں بہت دن نہیں رُک سکے۔ سات بھائی اور تین بہنوں پر مشتمل کنبہ تھا۔ بچے بڑے ہونے لگتے ہیں تو گھر کو چھوٹا ہی ہونا پڑتا ہے۔ چچاؤں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ پھوپھیاں تو رخصت ہو کر اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ اُس وقت اتنے زیادہ لوگوں کے ساتھ بھی اتنے بڑے گھروں کی خواہش کسی کو نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اب ہے۔ جگہ کی تنگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹوں کے لیے بڑوں کو کچھ قربانیاں پیش کرنی ہی ہوتی ہیں۔ احمد سعید نے اپنے اہل وعیال کو سمیٹ کر ہجرت کا آغاز کیا۔ بھائی بہنوں میں چوں کہ ابا سب سے بڑے تھے۔ جیسے تیسے رہنے کا ٹھکانہ

ہو ہی گیا مگر خرم کا دل اس نئے گھر یا بستی میں نہیں لگ رہا تھا۔ یہ اتنا آسان ہوتا بھی نہیں ہے۔ ساز و سامان کے ساتھ بدن بھی ہاتھ پیروں کے سہارے منتقل ہو جاتے ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ دل و۔۔۔ دماغ۔۔۔۔۔؟

خرم نے بڑوں سے سُن رکھا تھا کہ جہاں بندے کی نال گڑی ہوتی ہے، وہاں اُس کا اور بھی بہت کچھ دفن ہوتا ہے۔ تو پھر ایسے کیسے ختم ہو جائے گا سکندر اور ریحان تو اُس وقت کچھ سمجھدار ہو گئے تھے مگر خرم تو گود میں تھا۔ خرد تو بہت بعد میں یہاں پیدا ہوئی تھی۔ ان دونوں کا من بہت عرصہ تک اُچاٹ ہی رہا۔ اماں، ابّا سے اُن کی اداسی نہیں دیکھی جاتی اور وہ کئی کئی دنوں کے لیے دونوں کو دادی، دادا کے پاس چھوڑ آتے، اُس وقت بچوں کی پڑھائی کا حرج، عذر کے طور پر چلن میں نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خرم کا جھکاؤ اپنے ددیہال کی طرف تھوڑا زیادہ تھا۔ وہ سب سے چھوٹا پوتا تھا اُس وقت، اس لیے دادی، دادا اُسے ہاتھ کا پھپھولا بنائے رہتے۔ خرم نے اپنے والدین اور بڑوں سے پچھلے وقتوں کے اتنے قصے، واقعات سُن رکھے تھے کہ یاد ہو جانے کے علاوہ کبھی تو ایسا لگتا کہ جیسے وہ خود بھی موجود رہا ہے۔ ماضی اور اُن قدروں سے اُس کی ذہنی وابستگی تھوڑی زیادہ تھی، شائد اس لیے خرم کو ایسا لگتا ہو۔

بھائی جان بہت محتاط قسم کے آدمی تھے۔ نرم دل اور محسن تو تھے مگر ہر کسی سے ربط وضبط نہیں رکھتے تھے۔ جذبات پر قابو زیادہ تھا اس لیے آسانی سے بے تکلف نہیں ہوتے۔ نفاست اور وضعداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، جیب میں پیسے ہوتے ہیں تو پھر کرنے دفر کے لیے بازار نہیں جانا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ خرم کو شروع سے ہی وہ بہت چاہتے تھے۔ بچے جلد ہی لوگوں کا نظریہ بھانپ لیتے ہیں۔ خرم کو بھی معلوم تھا کہ بھائی جان اس سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتے تھے، رشتے میں استحکام بھی پیدا ہو رہا تھا۔ پیسے اور چاکلیٹ تو سبھی بچوں کو دیے جاتے ہیں۔ بڑے ہونے پر بھائی جان، خرم کی مالی اعانت بھی کرتے، ضرورت پڑنے پر وہ خود بھی مانگ لیتا تھا۔ خالی اوقات میں انھوں نے خرم کو

اپنے دفتر آنے کی دعوت بھی تھی جسے وہ خوش اسلوبی سے ٹال گیا۔

اُسے یاد آتا ہے کہ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا ہے، بھائی جان کو صاحب ثروت ہی دیکھا ہے۔ اس گھر کے اقتصادی حالات بھائی جان کی ہی وجہ سے بہتر ہوئے تھے۔ بھائی جان نے اپنے چھوٹے بھائی مستقیم کے ساتھ مشین بنانے کا ایک کارخانہ شروع کیا تھا جو اُن دونوں کے بچوں کے بڑے ہونے تک پھلتا پھولتا رہا۔ پیسوں کی فراوانی کے ساتھ خیر و برکت بھی نظر آ رہی تھی۔ بھائی جان غریب لوگوں کی خاطر خواہ مدد کیا کرتے تھے۔ دونوں نے مل کر پہلے بہنوں کی شادیاں کیں اس کے بعد بہت وقت نہیں لگا جب اپنے بچوں کی شادیوں کا وقت بھی آ گیا۔ احمد معید کے علاوہ پانچ بھائی اور تھے جنھوں نے نقل مکانی کی۔ وہ لوگ مالی اعتبار سے بہت بہتر پوزیشن میں نہیں تھے۔ بس گزر بسر ہو رہا تھا۔ بھائی جان جیسا پوڑھا کوئی بھائی نہیں تھا۔ کارخانہ دو بھائیوں کی شراکت میں تھا اس لیے دونوں حقدار بھی برابر تھے۔ زمین، جائدایں بھی خریدی گئیں، اس میں دونوں یکساں طور پر حصہ دار تھے تمام ذمے داریوں سے سبکدوشی کے بعد چین وسکون کے ساتھ زندگی گزر رہی تھیں۔ بچوں کا کاروبار میں دخل تو پہلے ہی شروع ہو گیا تھا مگر اب دخل اندازی شروع ہو گئی تھی اور یہیں سے اختلاف کی بیل منڈیر چڑھتی ہے۔

دونوں بھائی جسمانی طور سے کمزور ہو رہے تھے۔ آخر کار بچوں کو ہی کاروبار سنبھالنا تھا جو انھوں نے سنبھال بھی لیا، اُن کے لاشعور میں یہ تھا کہ وہ اپنے بڑوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ جدید دُنیا کے بارے میں بھی اپنے بڑوں سے زیادہ جانتے ہیں، لہٰذا تجارت بھی اُن سے بہتر کریں گے۔ نسلوں میں جو اخلاق و اقدار کا فرق آیا ہے، وہ بہت واضح ہے مگر نئی نسل نہیں مانتی تو فطری بات ہے کہ اصول و ضوابط کے اختلاف تو ابھریں گے ہی۔ بڑوں کا احترام اور نفع و نقصان سے یہ نئی نسل کسی حد تک ناواقف ہے۔ جو لوگ رسماً کچھ لحاظ کر بھی لیتے ہیں تو اُن کا تناسب بہت مایوس کن ہے۔

دونوں بھائیوں کے بیٹے کاروبار کا مزاج اور نشیب و فراز سمجھ چکے تھے۔ اب ایک

کی مرضی کی تائید دوسرا صرف اس لیے نہیں کرتا کہ کاروباری شراکت ہے یا وہ آپس میں بھائی ہیں۔ Like یا Dislike بھلے ہی سوشل میڈیا (Social Media) سے سیکھا ہو مگر اُس کا اطلاق تو عملی زندگی پر بھی ہوگا اور اس کا آغاز بھی ہوگیا۔ پودا دو چار دن میں تناور درخت نہیں بنتا ہے۔ اُسے وقت لگتا ہے۔

پہلے سامنے والے کی بات سے متفق نہ ہونا اور پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جانا کہ چلو پہلی بار ہے۔ درگزر کر دیا جائے۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔ جب پہلے سے آئندہ کے لیے ذہن میں نفی کو ٹھہرنے دیا تو اگلی بار انکار یقینی ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایسا ہوا بھی۔ اس کے بعد بہت وقت نہیں لگا جب دونوں کا ایک دوسرے پر اعتبار بھی ختم ہوگیا۔ اور پھر فیصلے کی وہ بری ساعت بھی آگئی جب چار باہر کے لوگوں کو بیٹھانا پڑا۔

شبیر اور مستقیم اس بات کے لیے راضی نہیں تھے مگر معاملہ اب اُن کے اختیار سے باہر کا تھا۔ دونوں کی اولادوں کو لگ رہا تھا کہ پارٹنر شپ میں اُن کا نصف خسارہ ہو رہا ہے۔ اب فیصلے لینے کی طاقت انہیں کے پاس تھی اور وہ مفاہمت کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا سی دیر میں تمام نقدی و سرمائے کی تقسیم ہوگئی۔ کارخانے کا کیا کیا جائے۔؟ اس میں البتہ ایک پیچ آگیا تھا۔ یا تو کارخانہ فروخت کر کے دونوں بھائیوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے۔ بھائی جان نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک کو فرم کا نام اور دوسرے کو املاک عطا کر دی جائے۔ بھائی جان بہت ذہین آدمی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مستقیم فوراً راضی ہو جائیں گے۔ فرم کے نام کی اہمیت سے وہ واقف نہیں تھے۔ چوں کہ اُس کی کامیابی میں بیشتر کوششیں بھائی کی تھیں۔ بھائی جان نے ایک عقل مندی اور کی، وہ یہ کہ انھوں نے اپنے طور پر فرم کا نام طلب نہیں کیا۔ یہ فیصلہ انھوں نے بھائی مستقیم پر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہیں، لے لیں۔ حسب توقع بچوں سے رائے مشورے کے بعد کارخانہ انہیں مل گیا اور کارخانے کا نام بھائی جان کو۔ جن لوگوں سے کاروباری لین دین تھا، ایک گھنٹہ میں اُن سب کو اطلاع کر دی کہ اب وہ اکیلے مالک ہیں اور فرم کا محل

وقوع تبدیل ہوگیا ہے۔وکیل کو بلا کر مالکانہ ڈیڈ (Deed) بنانے کا بھی کہہ دیا۔

گھر بھی دونوں کا ایک ہی تھا۔دُور اندیش تھے اس لیے شائد ایسے کسی وقت کے آنے کا اندازہ پہلے ہی تھا اس لیے گھر کی تعمیر میں حد بھی مقرر کردی گئی تھی۔بیس مینٹ (Base ment) سے لے کر چھت تک چاروں منزلوں میں سیاہ پتھر کی ایک باریک لکیر کھینچ دی گئی تھی۔یہ لکیر وسط سے عمارت کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔اتنے عرصے تک زمین پر بے کار پڑی رہی، آخر کار اُس کا بھی وقت آیا اور وہ دماغ تک آ گئی۔

دونوں کے حصے میں دو۔دو منزلیں تھیں پہلی منزل پر دونوں کے کنبے رہائش پذیر تھے۔خوب بڑا سا صحن تھا۔ڈھیر سارے پودے گملوں میں لگے ہوئے تھے۔ایک بڑا سا آہنی جھولا، جو اپنے ہی کارخانے میں بنا تھا، اس آنگن کی زینت ہوا کرتا تھا۔دونوں کی فیملی بڑی تھی اور رشتے داروں کے آنے کا رواج بھی بہت زیادہ تھا۔ بڑی رونقیں ہوا کرتی تھیں مگر اب وہ رعنائی جمال کہاں۔۔۔؟شبیر چچا کی اہلیہ جمیلہ چچی بھی کیا نستعلیق خاتون تھیں۔وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھیں۔اس گھر کے در و بام اُن کے اخلاص کی خوشبو سے معطر تھے۔آئے دن انواع واقسام کے کھانے پکاتیں اور خاندان کے کمزور لوگوں کو بطور خاص مدعو کرتیں۔انہیں اس میں زیادہ خوشی ملتی۔

شبیر چچا یعنی بھائی جان تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ عقل مند بھی بہت تھے۔سیاسی اور معاشرتی لوگوں سے اچھے مراسم تھے۔آئے دن ایسی ہی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔تکرم باز بھی بہت تھے۔اسی وجہ سے سرکاری ٹینڈرس (Tenders) کی حصولیابی آسان کرلی تھی۔گھر میں پیسے کی جب ریل پیل شروع ہوئی تو اثر ورسوخ بھی بڑھنے لگا۔کم گو ہونے کی وجہ سے رعب دار شخصیت بھی ہوگئی۔سب سے فوراً بے تکلف نہیں ہوتے ہر کس وناکس کے آگے لحاظ کی ایک لکیر خود بہ خود وضع ہوجاتی۔خرم کے حافظے میں نہیں تھا کہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی یا حق تلفی کی ہو۔لوگوں کی مدد کرنے والے آدمی تھے مگر بڑی خاموشی سے یہ گر اور سلیقے انہیں اُن کی بیگم نے سکھائے تھے۔

چچی جمیلہ اُن کے مزاج کے بالکل برعکس تھیں۔ نماز، روزے کے پابند دونوں تھے مگر خوش اخلاقی کے معاملے میں وہ اپنے شوہر پر سبقت رکھتی تھیں۔ مزاج میں حد درجہ نرمی اور سادگی انہیں دوسروں سے الگ کرتی تھی۔ ایک خوبی اُن میں اور تھی جو بہت عام نہیں تھی۔ شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ خاندان بھر میں مشہور تھا کہ اُن کی جیسی شوہر پرست بیوی کوئی اور نہیں ہے۔ بھائی جان کو نہ کبھی اپنی بیگم کی جبیں پر شکن ملی اور نہ ہی بستر پر۔ شادی کے چند مہینوں بعد ہی جمیلہ کو اپنے میاں کی تمام پسند وناپسند کا علم ہوگیا تھا۔ کچھ باتیں انہیں الگ سے بھی سمجھادی گئی تھیں۔ تب سے انھوں نے گرہ باندھ لی تھی۔ دوبارہ گھر والوں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ جمیلہ صرف اُمور خانہ داری میں ہی نہیں، رشتوں کو نباہنے میں بھی عام خواتین سے الگ تھیں اور اس پر اکثر لوگوں کی رائے یکساں تھی۔

کاروباری مصروفیت کی وجہ سے بھائی جان کا بیشتر وقت باہر ہی گزرتا۔ دوپہر کا کھانا البتہ وہ گھر میں ہی کھاتے پھر تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے۔ اس کے بعد جو نکلتے تو پھر دیر رات ہی واپسی ہوتی۔ اُن کی عدم موجودگی میں عزیزوں کی آمدورفت قدرے زیادہ ہوتی۔ ضرورت مند خواتین بھی اسی وقت حاضر ہوتیں۔ ایسے رشتے دار جو بھائی جان کی ناگفتنی کی وجہ سے آنے میں جھجکتے تھے، اُن کے نہ ہونے پر انہیں ایک طرح کی ذہنی آسودگی ہوتی اور وہ بے دھڑک آجاتے۔ یہ سب شبیر چچا کے علم میں رہتا تھا۔ جمیلہ بعد میں انہیں ہر بات اپنے طریقے سے بتادیتی تھیں۔ بھائی جان کو کسی کا آنا برا نہیں لگتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو بیگم کی وفاشعاری پر بھی حرف آتا۔ بس کم بولنے کی وجہ سے لحاظ اور اکرام بڑھتے بڑھتے ایک طرح کے خوف میں تبدیل ہوگیا ہے۔ مزاج کوئی خود تو بناتا نہیں ہے۔ اس لیے وہ بدل بھی نہیں سکتا تھا۔

جمیلہ کو جس قدر کھانا پکانے کا شوق تھا، کھلانے کا اُس سے کہیں زیادہ تھا۔ اُن کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جس خلوص ومحبت سے وہ کھلاتی تھیں، شائد

اسی وجہ سے ان کی ہنڈیا دوسروں سے کہیں زیادہ خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ بھی پکاتیں، لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ مالی اعتبار سے کمزور رشتہ داروں کو باقاعدہ بلاتیں اور ان کی ضیافت کرتیں۔ خرم کو یاد ہے کہ اُن میں ایک گھر اُس کا بھی تھا۔ ایسے پکوان جو عام طور سے گھروں میں نہیں پکتے تھے۔ وہ برابر اپنے یہاں اہتمام کرتیں۔ خرم بھی اپنے پسند کی غذاؤں کو کھانے کا اظہار بے دھڑک ہو کر چچی سے کر دیتا اور وہ فوراً خواہش کی تکمیل کرتیں۔ جتن سے پکانا اور عاجزی وانکساری سے کھلانا۔۔؟

اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی زبان سے اُن کھانوں کا ذائقہ نہیں جاتا۔ جمیلہ ضرورت مندوں کے ساتھ لینا دینا بھی خوب کرتیں۔ خاص بات یہ تھی کہ بہت خاموشی سے، تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ خرم آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لیتا ہے اور پھر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ ذرا سی دیر میں ماضی کس طرح اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا ۔۔۔۔ کیوں رخصت ہوئے جا رہے ہیں ایک اک کر کے سب اچھے لوگ ۔۔۔؟ ایک یوں ہی سا سوال ذہن میں اُبھرتا ہے۔ اُسے لگتا ہے چچا کی موت کے علاوہ اور بھی دُکھ ہیں جو اس وقت اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ تعزیت کے لیے اب تک کافی لوگ آ چکے تھے۔ گرد و نواح کا ماحول مزید سوگوار ہوتا جا رہا تھا۔

چچا اور چچی کے تعلق سے بے شمار یادیں تھیں جو ذہن میں مد و جزر برپا کیے تھیں۔ یادیں صرف تازہ ہی نہیں ہوئیں، خرم کو اپنے حصار میں جکڑے لے رہی تھیں۔ اُسے یاد آتا ہے کہ بھائی جان اپنی منکوحہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کی خوبیوں کے معترف بھی تھے مگر اظہار کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کیسے چلے جاتے۔ شعوری طور پر بھی اظہار سے گریز کیا ورنہ اُس رعب دار شخصیت پر سوال قائم ہوتے۔ بھائی جان سخت قسم کے مذہبی آدمی نہیں تھے مگر کسی وجہ سے تھیٹر میں فلم دیکھنے پر پابندی لگا دی تھی۔ مرتے مر گئیں مگر ٹاکیز کا رُخ نہ کیا۔ کون سی کوشش تھی جو نہیں کی گئی مگر جمیلہ نے شوہر سے کیا عہد وفا نہیں توڑا۔ کسی عزیز کے یہاں ملنے جُلنے بھی جاتیں تو بہت محتاط

رہتیں۔ پابندیٔ وقت کا بہت زیادہ خیال رکھتیں۔ ایک دم سے کرنٹ سا لگ جاتا۔ سرعت سے اُٹھ جاتیں۔ ''یہ آنے والے ہوں گے۔۔۔ میں جا رہی ہوں''۔ پھر کوئی کتنا ہی روکے، کیسا بھی واسطہ دے، جمیلہ نہیں رُکتیں۔ حیرت کی بات یہ ہوتی کہ چوکھٹ کے اندر آنے کے چند لمحوں کے بعد ہی شوہر نامدار گھر میں داخل ہوتے۔ یہ خود سپردگی اور خدمت کا کون سا باب ہے، ایسا کیسے اور کیوں کر ہوتا تھا، یہ شائد کسی کو نہیں معلوم۔۔۔؟

جمیلہ کے اندر شبیر کا کچھ خوف بھی طاری تھا۔ کبھی ہنڈیا میں نمک، مرچ کم یا زیادہ ہو جاتا تو اُن کی تھرتھری چھوٹ جاتی۔ ہر چند کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہو مگر پتہ نہیں کیوں انہیں خدشہ سا رہتا۔ وہ بغور اُن کے تاثرات کا جائزہ لیتیں اور جب یہ یقین ہو جاتا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے، تب کہیں جا کر اطمینان کا سانس لیتیں۔ بھائی جان کو اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا۔ عمدہ کھانے پکانے والی بیوی مل گئی تو ذوق و شوق کو مزید بڑھاوا ملا۔ انہیں کھانوں کی معلومات بھی تھی۔ نمک، مرچ کیا وہ تو زیرا، جاوتری جیسے مسالوں کی کمی بیشی پر بھی گرفت کر لیتے۔ ہر طرح کے گوشت کے بارے میں بھی حیران کر دینے کی حد تک معلومات تھی۔ بھائی جان لوگوں کے سامنے اپنی خوشی کا بے تکلفی سے اظہار نہیں کر پاتے مگر اپنی بیگم کی تعریف کرنی ہوتی تو اُن کی سادگی اور معصومیت پر یا کسی دن کھانے کے ذائقے سے زیادہ ہی خوش ہو جاتے تو بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا دیتے۔ اس مسکراہٹ کی افہام و تفہیم سے صرف جمیلہ ہی واقف تھیں۔ اس انعام کے عوض جمیلہ چچی کئی دنوں تک بہت خوش دکھائی دیتیں اور اچھے کھانوں کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہتا۔

ایک بار کا واقعہ معاً اُس کے ذہن میں اُبھر آیا۔ چچا شکار پر گئے تھے۔ جمیلہ چچی اس لیے زیادہ خوش ہوئیں کہ انھیں موقع مل گیا لوگوں کو بُلانے کا۔ چچا کے نکلتے ہی انھوں نے کچھ لوگوں سے رائے مشورہ کیا اور ایک طرح سے ڈگی پٹوا دی گئی کہ ''آج

کھچڑا پک رہا ہے۔۔۔۔سب لوگ آجائیں۔۔۔'' چچی کے حلقہ بگوشوں کی باقاعدہ ایک فہرست تھی۔ ذرا ہی دیر میں سب کو خبر مل گئی۔ تیاریاں بھی شروع کر دی گئیں۔ سب لوگ خوش تھے کہ آج خوب مستی ہوگی لیکن ہونی کو کچھ اور منظور تھا۔

اُدھر بھائی جان کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی اور انھوں نے ٹھیک ہونے کا انتظار کیے بغیر آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُن کے پاس ایک دوا تھی جو فوراً انھوں نے کھا بھی لی مگر لوٹنے کی ضد پر اَڑ گئے۔ ساتھیوں نے ہمّت افزائی کی اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر واپسی کی ضرورت ہوگی تو ہم سب واپس چلیں گے۔ تھوڑا ٹھہر کر انتظار کر لیتے ہیں۔ بھائی جان نے یہ تجویز نامنظور کر دی۔ کہا کہ ''میری وجہ سے تم لوگ اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔ میرا ذہن اب سیر و تفریح کے لیے راضی نہیں، لہٰذا میرے جانے میں ہی بہتری ہے۔'' بقیہ لوگوں کو لگا کہ یہ ٹھیک مشورہ ہے کیوں کہ کوئی تشویشناک صورتِ حال نہیں تھی۔ وہ اب پہلے سے خاصے بہتر دکھ رہے تھے۔

گھر پر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھائی جان واپس بھی آسکتے ہیں۔ گھر میں اکثر لوگ آچکے تھے۔ کچھ لڑکیاں اور خواتین جمیلہ کا ہاتھ بٹانے میں لگ گئی تھیں۔ بچوں نے ہڑدنگ شروع کر دیا تھا۔ قید کے بعد کی آزادی کا جشن اور مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا اور تبھی غیر متوقع طور پر اچانک دہلیز کے پاس بھائی جان آکر کھڑے ہو گئے۔ پہلی نظر جمیلہ چچی کی ہی پڑی۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ گھگھی سی بندھ گئی۔ حیرت چھپائیں کے خوف۔ وہ تو ایک دم حواس باختہ سی ہو گئیں، جیسے اُن کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ان کے اپنے اختیارات کا انہیں کچھ علم ہی نہ تھا۔ ایسے کسی کام کی پابندی نہیں تھی ورنہ تو وہ سوچتی بھی نہیں۔ جن باتوں کے لیے شوہر نے منع کیا تھا اُن کے خیال سے بھی بچنے کی کوشش کرتیں۔ بھائی جان اس طرح کی محفلوں میں خود کو شامل نہیں کر پاتے اس لیے ایسی تقریبات کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ اُن کی بیگم سامنے یا عدم موجودگی میں کچھ کر بھی لیتیں تو وہ خفگی کا اظہار نہیں کرتے اس کے باوجود

لوگوں کے اندر اتنا ڈر بیٹھا تھا کہ کوئی ذہنی شکست وریخت سے بچ نہیں پاتا۔ اُن کی ساری پلاننگ دھری رہ گئی۔ رخنہ تو پڑ ہی گیا تھا۔ پہلی فکر تو یہ کہ واپسی کی کیا وجہ ہے؟ کسی کو نہیں معلوم کہ اگلے لمحہ کیا ہونے والا ہے؟ اُس دن تو ماموں نے نئی تاریخ ہی رقم کر دی۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ماموں اس اُفتاد سے بچا لیں گے۔

''اماں ۔۔۔ اس وقت ۔۔۔ آپ یہاں ۔۔۔ گھر میں آنے کا کوئی وقت ہوتا ہے، کچھ اُصول وآداب ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ کیا کہ جب منہ اُٹھایا اور چلے آئے۔''

''چاہے وہ اپنا ہی گھر کیوں ۔۔ ہو۔'' اپنا پر بھائی جان نے کچھ زیادہ ہی زور دیا۔ جواب میں ماموں پھر گویا ہوئے۔ ''ہم لوگوں نے سوچا کہ سب اکٹھا ہو جائیں گے تو اچھا لگے گا۔ میں تو باجی کے یہاں ناشتہ کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ یہ تو بس اتفاق رہا کہ باجی نے بتایا کہ صاحب شکار پر گئے ہیں اور واپسی کل ہو گی تو میں نے ہی باجی کو مشورہ دیا بلکہ سچ کہوں تو کھچڑے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ نعمت اور کہیں تو نصیب نہیں ہوتی اس لیے باجی سے اپنا حق جتا دیا۔'' جمیلہ چچی حیرت زدہ تھیں کہ ماموں اتنے ہوشیار کب تھے۔ اتنے سلیقے سے انھوں نے بات بنائی کہ جمیلہ چچی کو بالکل بے قصور ثابت کر دیا۔ اپنی باتوں پر سب سے زیادہ تعجب خود انہیں ہی تھا۔ چچی کو صرف اپنے تاثرات پر قابو پانا تھا۔ چند ساعتوں کے بعد ماموں پھر سے گویا ہوئے۔ ''اللہ کی قسم اگر ذرا سا شبہہ بھی ہوتا کہ آپ تشریف واپس لا سکتے ہیں تو کیوں کر یہ گناہ سرزد ہوتا۔ ویسے سبب کیا بنا واپسی کا۔؟''

ماموں کے منہ میں جیسے کسی اور کی زبان ہو۔ جانے کیا خاص بات تھی اُس دن ورنہ سب کو یقین ہو چلا تھا کہ اس گفتگو کے بعد ماموں کی خیریت نہیں مگر تحیر کے کچھ پردے ابھی اُٹھنے باقی تھے۔ بھائی جان مسکرا دیئے۔

''میاں منکشف الحق ۔۔۔ میں آپ لوگوں کی خوشیوں میں مخل نہیں ہو رہا ۔۔۔ آپ لوگ جیسے چاہیں انجوائے کریں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے جس کی وجہ سے

مجھے واپس آنا پڑا۔۔۔میں دوا کھا کر آرام کروں گا۔''

''یا اللہ۔۔۔خیر۔۔تو۔۔۔کیا ہوا ہے۔۔۔آپ کو۔۔۔؟'' کہتے ہوئے چچی اُن کے پیچھے کمرے میں چلی گئیں۔

''تم مہمانوں کو دیکھو۔۔۔کوئی ضرورت ہوگی تو میں بلوالوں گا۔'' بھائی جان کے کہنے پر انھوں نے غور سے میاں کو دیکھا۔ جیسے مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میرے بغیر اپنی بی پی، شوگر تک نہیں دیکھ سکتے ہیں آپ۔۔۔بیٹھیے، پہلے میں بی پی جانچ لوں۔۔۔دوا کھالی تھی۔

''ہوں۔۔'' آہستگی سے جواب دے کر فرمانبردار بچے کی طرح بیٹھ گئے۔ چچا کو لگتا کہ اُن کے بڑے نخرے ہیں جو اُن کی زوجہ بڑے ناز سے اُٹھاتی ہیں۔ اُدھر چچی کا خیال تھا کہ ایسا تو کچھ بھی نہیں۔ ذرا سی دیر میں اُن کے بی پی اور اور شوگر کی جانچ ہوگئی۔ بی پی تھوڑا سا بڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی انہیں اس طرح کی اُلجھن ہو جاتی تھی۔ وقفے سے بھائی جان اپنی جانچیں کرواتے رہتے تھے۔ کوئی فکر کی بات کبھی سامنے نہیں آئی۔ آج تو بھائی جان کا بی پی شائد ماموں کی باتوں کی وجہ سے کم ہوگیا تھا ورنہ جب آئے تھے تو یقیناً اس سے زیادہ رہا ہوگا۔ چچی نے انہیں لٹا کر کچھ دیر اُن کے پیر دبائے اور پھر ذرا دیر میں اُن کی جھپکی لگ گئی۔ چچی احتیاط سے اُٹھیں اور بڑی آہستگی سے کہ نیند میں خلل نہ پڑے، کواڑ سرکا کر باہر آگئیں۔

جو لوگ بھائی جان کی غیر متوقع آمد پر کونوں کھدروں میں جا چھپے تھے۔ حالات سازگار ہونے کی خبر ملتے ہی باہر آگئے۔ ماموں کے قصیدے اور تعریفیں ہوئیں تو لڑکیوں کی طرح شرمانے لگے۔ چہرے سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ خرم ذرا ارشد کے ساتھ چلے جاؤ۔۔۔کچھ کام ہے۔۔۔''لبّا نے اُس کے پاس آکر کہا تو وہ خیالوں کی تیز اور نکیلی جھاڑیوں سے بچ بچا کر باہر آیا۔ اُس کی زبان سے ہاں نکلا اور وہ پھرتی سے کھڑا ہوگیا۔ گلابی رنگ کی پُرشکوہ عمارت کو ایک بار پھر سے اور زیادہ غور سے دیکھا۔۔۔

یہ کبھی بہت سارے لوگوں کا گھر ہوا کرتا تھا۔ بہت سے دوسروں کے لیے بھی راحت جاں کا مرکز۔۔۔کیسی آماجگاہ رہا کرتی تھی کتنی ہی سرد وگرم یادوں کے گواہ ہیں یہ در و بام۔۔۔؟ سوچتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور بائک پر بیٹھ گیا۔

کفن کٹنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ محلے میں دو ہی لوگ تھے جو اس کام میں پیش پیش رہتے۔ وہ اسے اپنا فریضہ سمجھ کر کرتے تھے۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا یہ کام کرتے ہوئے کہ اب تو بہت ماہر ہو گئے تھے۔ بہت دُعائیں بھی حاصل کی تھیں۔ اُن میں سے ایک پچھلے ماہ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اب صرف انوار ماسٹر ہی اکیلے بچے تھے۔ وہ پیشے سے درزی تھے مگر انہیں ماسٹر کہا جاتا تھا اور یہ لقب انوار کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گیا۔

ایک کمرے میں دری، چاندنی بچھا کر قینچی اور لٹھا حاجی انوار ماسٹر کے سپُرد کر دیا گیا اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی انہیں غسل کی ذمے داری بھی اُٹھانی تھی۔ مٹی میں شرکت کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ سورج کی تپش بھی تیز ہو رہی تھی۔ تمبو لگا تو مگر تمازت نہیں روک پا رہے تھے۔

خرم کام سے فارغ ہو کر ایک بار پھر گھر کے اندر موجود تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔ رُک رُک کر دائیں بائیں سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن میں خاصی تعداد میں عورتیں جمع تھیں۔ کافی بڑا صحن تھا مگر اس وقت تنگ ہو گیا تھا۔ اسی آنگن میں حد بندی کی لکیر تھی جو اس وقت بھیڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ بھائی جان کی تینوں بیٹیاں رو رو کر نڈھال ہو گئیں تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرد میں صبر و ضبط عورت سے زیادہ ہوتا ہے لیکن اُن کے بیٹے بھی رونے پر قابو نہیں کر پا رہے تھے۔ باپ کے سائے کا سر سے اُٹھ جانا، یہ کوئی بہت سے دوسرے غموں میں سے ایک غم نہیں ہے۔ بلکہ تمام ملا کر بھی اس دُکھ کی برابری نہیں کر سکتے۔ یتیم کے بارے میں سوچنا اور یتیم ہو جانا، دو بالکل الگ باتیں ہیں۔ رشتہ اور پھر اُس سے تعلق یا وابستگی ہمارے ہنسنے یا رونے کی میعاد متعین کرتے ہیں۔

بھائی جان کی بیٹیاں بہت لائق تھیں۔ رشتوں کا پاس کرنے اور چھوٹوں سے

شفقت کرنے ولی۔ اچھے اخلاق کے لیے خاندان میں اُن کی تعریفیں بھی ہوتیں اس کے لیے وہ اپنی ماں کی تربیت کی پذیرائی کرتیں۔ بھائی جان بھی بیٹیوں پر جان چھڑکتے تھے۔ لڑکیاں زیادہ حساس اور جذباتی ہوتی ہیں اور فطری طور پر ماں کے مقابلے باپ سے ذہنی طور پر زیادہ قریب ہوتی ہیں۔

آنگن میں بائیں جانب دیوار کے پاس رکھا ہوا فرّاٹا پنکھا چل رہا تھا۔ اتفاق تھا کہ خرم اُسی سمت دیکھ رہا تھا۔ مستقیم کا بڑا بیٹا اسماعیل سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ کچھ فکر مند تھا۔ اُس نے چاروں طرف کا بغور جائزہ لیا۔ وہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ خرم کو یہ یقین تو ہو گیا کہ کچھ تو ہے اور تبھی اُس نے دیکھا کہ اسماعیل نے بہت پھرتی سے پلگ نکال کر برابر والے دوسرے سوئچ میں لگا دیا تھا۔ یہ کام اتنی تیزی اور صفائی سے کیا کہ کسی کو بھنک تک نہیں لگی کہ ہوا کیا ہے۔ پنکھا اتنی دیر کے لیے بند ہوا تھا کہ اُس کے پر تھم بھی نہیں پائے تھے کہ پھر اُسی رفتار سے گھومنے لگے۔ خرم کا خیال تھا کہ اُس کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ہوا کہ دراصل کھیل کیا ہوا ہے؟ دو سوئچ بورڈ، صحن میں عمارت کو منقسم کرنے والی لکیر کے بالکل سیدھ میں لگے تھے۔ دونوں کے حصے میں ایک ایک بورڈ لگا تھا۔ پنکھے کا پلگ لگانے والے کو نہیں معلوم تھا کہ یہ سوئچ کس میں لگنا ہے۔ اسماعیل نے وہ غلطی دُرست کر دی تھی۔ اسماعیل اپنا کام انجام دے کر فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ خرم اپنے چہرے پر بنتے بگڑتے تاثرات پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ وہ حیرت اور افسردگی بھی پوشیدہ رکھنے میں ناکام تھا۔ خرم کے لیے بھی وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ اُس کا ابھی اندر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس یوں ہی غیر ارادی طور پر وہ آ گیا تھا۔ شائد اُوپر والے کو یہ دکھانا تھا۔ باہر آتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسماعیل جیسے لوگ اپنے اجداد کے ورثے کے امین اور محافظ ہیں۔ عمارتیں اپنی جگہ پر ایستادہ رہتی ہیں۔ بلند و بالا مکانات بھی ساکت رہتے ہیں، بس مکین بدل جاتے ہیں پھر اُس کے ساتھ کیا کچھ تبدیل ہو جاتا ہے اس کا حساب وقت ہی اپنے پاس محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ہر آنے والی ساعت، گزرے ہوئے لمحے

کے تمام نقش ونگار اور اخلاقی قدریں، اُن کے تکبّر کو نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ نئی نسل کی ترجیحات میں اب مکین ہیں بھی نہیں۔ لمبی اور گہری سانس لے کر خرم باہر آ گیا۔

خاصی کشادہ جگہ پر کرسیاں وغیرہ رکھی گئیں تھیں۔ اب تو کوئی کرسی خالی بھی نہیں تھی۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک کونے میں کوئی بندہ کرسی سے اُٹھا تو خرم کو بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ وہ اور زیادہ مغموم ہو گیا تھا۔ ابھی تک تو صرف بھائی جان کی موت کا غم تھا مگر یہاں نئے تماشوں نے اُسے ششدر بھی کر دیا۔ انوار ماسٹر غسل کے لیے دو تین لوگوں کے ساتھ اُس کے سامنے سے گزرے۔ تدفین میں آئے اکثر لوگ بھائی جان کی مدح سرائی میں مصروف تھے۔ سب اُن کی خوبیاں اور تعریفیں بیان کر رہے تھے۔ مرنے والا اگر اچھا انسان نہیں ہے تب بھی ایسے وقت میں اُسے کون بُرا کہتا ہے۔ بھائی جان تو یقیناً انتہائی نفیس آدمی تھے۔ خامیوں کے بغیر تو کوئی نہیں ہوتا مگر اُن میں بہت زیادہ اچھائیاں تھیں۔ مجبور اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور اس طرح کرنا کہ تشہیر نہ ہو یہ خوبی تو اچھے خاصے دینداروں میں نہیں ہوتی۔ نیکی کر دریا میں ڈالنے والا مزاج تھا۔ خرم نے بچپن سے سن رکھا تھا کہ نیک آدمی کی میت میں مجمع بہت ہوتا ہے۔ یہ اُس کے اچھا ہونے کی ایک علامت ہے۔ یہ بات آج یہاں ثابت بھی ہو گئی۔ اُمید سے کہیں زیادہ لوگ آ چکے تھے اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔

شبیر چچا کے متعلق خرم نے ایک نئے زاویے سے سوچنا شروع کیا۔ مرحوم رشتے میں کسی کے کچھ نہ کچھ لگتے ہی تھے۔ کسی کے قریبی۔۔۔ تو کسی کے بہت قریبی۔۔۔ کسی کے دور کے۔۔۔ اور کسی کے۔۔۔۔ بہت دور کے۔۔۔ کس کو کتنا دُکھ ہوا ہوگا۔ کیا رو لینے یا رونے جیسی صورت بنا لینے سے مرنے والے سے تعلق اور غم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دل کے تعلق میں جہاں صرف اخلاص اور نیک نیتی شامل ہو، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا نہیں۔۔۔ کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بغیر عہد و پیماں کے بھی دونوں کو معلوم رہتا ہے۔ مال و زر خرچ کیے بنا بھی خود اعتمادی اور افتخار، فریقین کی صرف باتوں

سے ہی نہیں چہرے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

شادی بیاہ کی تقریب ہو یا سانحہ ارتحال۔۔۔۔ اکثر لوگوں کے شرکت کرنے کی وجہ وہ نہیں ہوتی جو دکھائی دیتی ہے یا پچھلے زمانوں میں ہوا کرتی تھی۔ خوشی کی تقریبات میں تو خیر عمدہ اور لذیذ کھانوں کا اہتمام بھی ہوتا تھا مگر موت مٹی والے گھر میں بھی ''لوگ کیا کہیں گے'' کے خوف سے زیادہ آتے۔ یہ خیال بھی رہتا کہ خاصے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس بہانے اجتماعی غیبت کا موقع بھی فراہم ہو جائے گا۔

صبح سے اب تک کچھ گھنٹوں میں ہی کس قدر فرق نمایاں تھا۔ چند لوگوں کو چھوڑ کر ماحول کسی حد تک نارمل بھی ہو گیا تھا۔ بیشتر لوگ اپنے پسند کے موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ قبرستان سے اکثر لوگ تو اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ چند لوگ ہی واپس آتے ہیں۔ جنازہ اُٹھنے سے پہلے کا وقت گفتگو کے لیے سب سے مناسب رہتا ہے۔ خرم ایک کونے میں بھیڑ سے دور بیٹھا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بھائی جان کے تعلق سے بے شمار باتیں اور واقعات اُس کے ذہن میں اُمڈ رہے تھے۔ اس علاقے سے اُس کی اپنی کتنی ساری یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ آج اتنے عرصے بعد کتنی ساری شکلیں اُس نے دیکھی تھیں۔ اُس کا بچپن انہیں گلی، کوچوں میں کھیلتے شرارتیں کرتے ہوئے گزرا ہے۔ اُس زمانے کے اُس کے یہاں کے سب دوستوں کی شادیاں ہو گئیں۔ کئی کئی بچوں کے باپ ہو گئے۔ اُس وقت جو جوان تھے، اب ادھیڑ ہو رہے تھے۔ یہاں سے راہ گیر کی طرح گزرنے میں اور ٹھہر کر دیکھنے میں فرق سامنے آ رہا تھا۔ اس طرف آنا جانا کم تو ہوا تھا مگر بند نہیں ہوا تھا۔ جس طرح آج بہت سی چیزوں کو اطمینان سے دیکھا تھا پہلے کئی کے کچھ اور معنی ہوا کرتے تھے۔

وقت ناخون بھی ہے اور مرہم بھی۔ یہ زخموں کو مندمل بھی کرتا ہے اور کرید بھی دیتا ہے۔ اس کے اندر بہت نرمی بھی بھری ہے اور یہ سفاک بھی اتنا ہی ہے۔ جب یہ کسی کی طرف سے آنکھ پھیرتا ہے تو چہرے کے خد و خال ہی نہیں، نظر نہ آنے والی صفات بھی مسخ

کر دیتا ہے۔اس کے نشانات دیر پا ہوتے ہیں۔؟ کسی نے خرم کو سلام کیا تو اُس کا تسلسل ٹوٹا۔ وہ اپنے خیالوں کی خلقت سے باہر آیا۔آج اُسے جمیلہ چچی خاص طور پر بہت یاد آرہی تھیں۔اُس کے سامنے دیدہ زیب پُرشکوہ عمارت جس کے سائے میں وہ بیٹھا ہوا تھا۔کیا یہ صرف ایک بلڈنگ ہے۔کتنے موسموں کے سرد و گرم یا تھپیڑے اس نے دیکھے ہیں۔ اس کے دروں میں کیا کچھ پوشیدہ ہے۔ بھائی جان نے اس کی تعمیرات اور آرائش کے علاوہ بھی بہت کچھ بنایا ہے۔جمیلہ چچی وہ عورت تھیں جو گھر کو جنت بناتی ہیں۔ضیافت، خاطر مدارات کے علاوہ دوسروں کو کیسے خوش رکھا جائے، اُن کا نصب العین بس یہی تھا۔اس گھر کی تمام خوشیاں اور رونقیں انہیں کے دَم سے تھیں۔اُن کے انتقال کے بعد شفق رنگ اس گھر کے در و بام پر نہیں دکھے۔اُن دنوں کی زعفرانی خوشیاں اور خوشی میں نکلنے والے قہقہوں کی بازگشت بھی اُن اچھے اور بیش قیمت لوگوں کے ساتھ معدوم ہوگئیں۔ جمیلہ چچی کا انتقال ہوئے اگلے مہینے تین سال پورے ہو جائیں گے۔لگتا ہے جانے کتنا عرصہ گزر گیا۔ وہ کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھیں۔مرض کی تشخیص سے تارِ نفس ٹوٹنے تک کی مدّت اتنی قلیل تھی کہ کسی کو کچھ موقع ہی نہ ملا۔اُن کی خدمت یا اُن سے جی بھر کے باتیں کرنے کی خواہش؟ کتنی ہی قیمتی چیز ہو، دسترس میں آنے کے بعد اُس کی اہمیت میں خواہ تھوڑی کمی آئے مگر آتی ضرور ہے پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔

بھائی جان پر بیگم کی موت کا بہت گہرا اثر تھا۔ایک انتہائی غیر جذباتی شخص حیرت انگیز طور پر جذباتی بلکہ نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔کئی دنوں تک پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے تھے۔ جہاں بیٹھتے، جمیلہ کا ذکر چھیڑ دیتے۔اُن کی تعریفیں بیان کرتے۔کچھ ایسی خوبیاں جو کم لوگوں کو ہی معلوم تھیں۔شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کے تعلق سے۔ساتھ میں یہ بھی کہتے کہ انھوں نے جمیلہ کی قدر نہیں کی۔۔۔۔وہ غیر معمولی خاتون تھیں اور بس گھگھی بندھ جاتی۔ باقاعدہ تیز آواز میں بھی روتے تھے۔خرم نے جب پہلی بار اس طرح بے قابو ہو کر روتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنی حیرت چھپا نہیں پایا تھا۔اُسے کچھ عجیب سا بھی

لگا تھا۔ وہ جس شبیر چچا کو جانتا ہے اُس میں یہ صفت تو نہیں تھی۔ وہ اسی لیے متعجب تھا۔ اُسے کبھی کیوں نہیں لگا کہ اتنا سخت جان آدمی کبھی رو بھی سکتا ہے؟

پھر ایک ماہ بعد کہیں سے خبر ملی کہ بھائی جان دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں۔ خرم کی حیرت سے آنکھیں ہی نکل آئیں۔ وہ اتنا بے خبر اور ناواقف کب تھا۔۔؟ ابھی تک جو گریہ چل رہا تھا، وہ کیا تھا۔۔۔؟ عقدِ ثانی گناہ نہیں ہے۔۔۔۔ مگر۔۔۔ یوں اچانک۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔ اتنی عجلت۔۔ کس لیے۔۔۔؟ یہ تمام سوالات اُس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے جن کے جوابات کے لیے اُسے انتظار کرنا تھا۔ چند روز میں اس بات کی تصدیق ہو گئی بلکہ شادی کے تعلق سے کئی اطلاعات موصول ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ رشتہ تقریباً طے ہو چکا ہے۔ وہ ایک بیوہ ہیں اور اُن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ پہلے خاوند کی سڑک حادثے میں موت واقع ہو گئی تھی۔ دوسری شادی کے لیے وہ کبھی راضی ہی نہیں ہوئیں۔ اب تیار ہو جانے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس عمر میں ساتھی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ شاید یہی سچ بھی ہے۔ بتانے والے نے تو نام بھی بتا دیا۔۔۔ نسرین بانو ہے اور وہ ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک دن یہ خبر بھی آ گئی کہ معاملات طے ہو گئے اور کسی دن بھی نکاح کی خبر مل جائے گی۔ گھر والوں کو معلوم ہوا تھا تو سب کی سٹی پٹی گم ہو گئی تھی۔ بھائی جان کے ناتی پوتے جوان ہو گئے تھے۔ آدمی کچھ لحاظ شرم بھی تو کرتا ہے اور پھر اتنی جلد بازی۔۔۔؟ وہ لوگ جو بھائی جان کے سامنے مُنہ کھولنے کی جسارت نہیں کر پاتے تھے، اب جواب طلب کر رہے تھے۔ اولادوں کے علاوہ قریبی لوگوں نے بھی انھیں سمجھانے کی بہت کوششیں کیں۔ منتیں بھی کی گئیں، منفی نتائج بھی سامنے رکھے گئے۔ آخری حربے کے طور پر بھائی جان کے بے تکلف دوستوں سے بھی دباؤ ڈلوایا گیا مگر انھوں نے کسی کی بات کا پاس نہیں رکھا۔ آخر سب نے سپر ڈال دی لیکن رشتوں میں کچھ تلخی تو آ ہی گئی تھی۔ بیٹوں کو زیادہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی مگر معاملہ اُن کے بھی اختیار سے باہر جا چکا

تھا۔ سب کو جب یہ یقین ہو گیا کہ یہ شادی اب ہو کر ہی رہے گی تو اتفاق رائے سے اُن کے ایک دوست کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ کم سے کم افزائش نسل کے بارے میں ہی احتیاط برت لیں۔ اس مرحلے پر زمین، جائداد میں کوئی نیا حصہ دار کسی کو منظور نہیں۔ یہ تجویز بھائی جان نے فوراً قبول کر لی اور جمیلہ چچی کے انتقال کے چار ماہ پورے ہونے سے دو دن پہلے وہ نسرین بانو سے منسوب ہو گئے۔ یہ بھائی جان کی زندگی کا پہلا اور آخری بڑا فیصلہ تھا جو پوری طرح غلط تھا۔ سب کی مخالفت کے باوجود وہ اڑے رہے اور منوا کے ہی دم لیا۔ یہ سودا کس قدر خسارے کا تھا اس کے لیے بھائی جان کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

کہاوت ہے کہ ماں ہوئی دُوسری تو باپ ہوا تیسرا۔ حیرت انگیز طور پر گھر کے معمولات ہی نہیں طور طریقے بھی تبدیل ہونے لگے۔ محفلیں اور انجمن آرائیاں تو ختم ہونی ہی تھیں۔ کہاں کیا چل رہا ہے، براہِ راست کسی سے بتائے بغیر بھی سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اُسی کے زیرِ اثر لوگوں کی آمدورفت کم ہونے لگی تھی۔ یہ تو کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس کے لیے بھی منظم کوششیں کی گئیں تھیں۔ ایک اور مقدمہ سامنے آیا۔ بھائی جان کی اولادوں نے اپنی نئی ماں کو تخاطب کے طور پر اماں کہنے سے منع کر دیا ہے۔ آخر کچھ تو کہا جانا ہی تھا۔ لفظ آنٹی پر سب متفق ہو گئے۔ بھائی جان کو بھی کوئی عذر نہیں تھا۔

نسرین بانو بہت گھاگھ عورت تھی۔ بظاہر جتنی سادہ اور معصوم نظر آتی تھی، اندر سے وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ آنٹی نے اپنا اصلی روپ دکھانے کے لیے بہت وقت لیا بھی نہیں۔ بھائی جان پر نئی بیوی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگے۔ شام کا وہ وقت جب گھر واپسی پر وہ سب کو یکجا کر کے باہر بیٹھا کرتے تھے، وہ اب ایسا نہیں کر رہے تھے۔ مکالمہ میں کمی آتی ہے تو بدگمانیاں نہ بھی ہوں تو فاصلہ ضرور بڑھنے لگتا ہے۔ خونی رشتوں میں آدمی کا نظر سے دور ہو جانا تنہائی یا ذہنی اذیت کا سبب نہیں بنتا لیکن پاس رہ کر محبت اور اعتبار کا کم ہو جانا تنہا اور اُداس کر دیتا ہے۔ یہاں

اب ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔

نسرین بانو کی بھائی جان سے محبت اور وابستگی محض واہمہ تھی۔ وہ جسے ٹھنڈے پانی کا چشمہ سمجھ رہے تھے دراصل وہ سراب تھا۔ صرف نظر کا دھوکا۔ بہت جلد یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ پہلے شوہر کی موت کی ذمے دار بھی یہی تھی۔ بھائی جان چراغِ سحری تھے۔ بجھنے سے پہلے بھبھک کر جلنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے، بیٹیوں سے کس منہ سے بتاتے کہ دو وقت کے کھانے کے علاوہ بدن کے کچھ اور مطالبے بھی ہوتے ہیں۔ اُن تقاضوں کی تکمیل تو ہوگئی مگر اُس کے عوض انہیں تاوان کچھ زیادہ ادا کرنا پڑا ہے۔

اب ناتی پوتے اُن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کا وہ وقت بھی دیکھا ہے جب آپ براہِ راست توے سے اُتری روٹی کھاتے تھے۔ کبھی اپنا ایک رومال بھی خود نہیں دھویا اور اب کس کا کیا کیا دھو رہے ہیں۔ بستر پر آپ کو کبھی ایک شکن تک گوارہ نہیں تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ اب۔۔۔؟ آپکو کیسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ہم لوگوں سے چھپا رہے گا۔۔ یہ اندازہ کسی کو نہیں تھا کہ اس عمر میں یہ تماشا بھی دیکھنے کو ملے گا۔ آپ کے بیٹے بیٹی بھی بہت فکر میں ہیں مگر وہ آپ سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں جتا پا رہے ہیں۔۔۔ کتنا تو روکا گیا تھا آپ کو مگر۔۔۔؟ بھائی جان نادم۔۔۔ دم بخود سے بچوں کے سامنے کھڑے رہ جاتے۔ یہ جرأت و اختیار صرف وقت ہی کو ہے ورنہ کس کی مجال تھی جو اُن سے اس انداز میں گفتگو کر سکے۔ بھائی جان اتنے بے بس و مجبور تو کبھی نہیں دکھے۔

بڑے پوتے کی آوازوں کی بازگشت دیر تک اُن کے کان میں گونجتی رہی۔ بستر پر گئے تو وہاں بھی وہ صدائیں اُن کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ’’دادا۔۔۔ فریج کا وہ باسی اور ناپسندیدہ کھانا جو آپ نے کبھی نہیں کھایا۔۔۔ اب خود گرم کر کے کھاتے ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ دوبار کھانا گرم کرنے میں آپ کا ہاتھ بھی جل چکا ہے۔ ایسی کیا مجبوری ہے دادا۔۔۔ کوئی بھائی جان کو اب دیکھے تو وہ یقین نہ کر پائے گا کہ ابھی چند ماہ قبل یہ آدمی کیسی زندگی گزار رہا تھا۔۔۔ بھائی جان کسی سے کہتے بھی کیا۔ یہ فیصلہ تو

انہیں کا تھا اور سب سے زیادہ اذیت دینے والی بات یہی تھی۔ اُن کے ہونٹوں پر چُپ سی لگ گئی تھی۔ اندر سے انہدام کی آہٹیں اب باہر بھی آنے لگی تھیں۔

جمیلہ کے جہیز کا وہ بیڈ جس پر وہ تقریباً چالیس برس سوئیں۔ اب ایک دوسری عورت کی تحویل میں تھا۔ شرعی کسی عذر کے بغیر بھی کچھ باتیں تکلیف پہنچانے والی ہوتی ہیں۔ ایسی باتوں کی شکایت بھی نہیں کی جا سکتی۔ جمیلہ کی گرہستی کا قیمتی سامان یا تو غائب ہو رہا تھا یا اُسے نقصان پہنچایا جا رہا تھا، بچوں کی تاویل تھی کہ لاکھ وہ اُن کے باپ کے نکاح میں ہو مگر ہر رشتہ زبان کے ردّ و قبول سے ہی تو نہیں بنتا بگڑتا ہے۔ دل۔۔۔ دماغ۔۔۔ جذبے۔۔۔ اور احساسات، کسی چیز کے کوئی معنی ہیں کہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ نسرین بانو بھائی جان کے بچوں کی ماں ہیں مگر انہیں وہ مقام تو نہیں مل سکتا جو جمیلہ کا ہے۔ یہ کسی کے اختیار کے باہر کا معاملہ ہے۔ نسرین بانو اگر شفقت کا دامن وسیع کرتیں۔ یہاں کے لوگوں کا اعتبار حاصل کرتیں تو شائد بچے اُن کے پاؤں دھو کر پیتے مگر جو کچھ ہو رہا تھا وہ کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایثار و ہمدردی سے کسی کے دل میں بھی نرم گوشے پیدا کیے جا سکتے ہیں پر یہاں تو مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی۔

خبریں کمرے سے باہر آنے لگی تھیں۔ ایک دم سے بڑی اور ہنگامہ خیز خبر آئی کہ آنٹی نے زیورات کے علاوہ بڑی رقم پار کر دی ہے۔ افواہ تو یہ بھی اُڑی کہ کہیں ایک فلیٹ خرید لیا ہے۔ بھائی جان پر تو نسرین بانو کا جیسے سحر طاری تھا۔ اس قدر محتاط اور دور اندیش آدمی کون سی چپڑی باتوں میں آ گیا کہ چیک بک اور لاکر کی چابی بھی اُن کے حوالے کر دی۔ آنٹی نے خوب اللّے تللّے کیے ہیں۔ بھائی جان خود کو لُٹتا ہوا دیکھ رہے تھے اور اُف بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کا منفی اثر اُن کی صحت پر پڑنا شروع ہوا۔ مالی خسارہ کے تخمینے کی وضاحت ہوئی تو بھائی جان کے اٹیک (Attack) پڑا۔ مضبوط ارادوں والے آدمی تھے شائد اسی لیے جھیل گئے۔ اس پہلے حملے سے اُبر تو گئے مگر دھچکا تو لگ ہی گیا تھا۔ یہ نظامِ قدرت بھی ہے کہ آدمی کتنا ہی سخت جان ہو مگر ہوتا تو گوشت پوست کا ہی

ہے۔ سرد ہوائیں برفیلے تودے پگھلا دیتی ہیں۔ بھائی جان کو شوگر، بی پی کا مسئلہ تو تھا، اب مزید عارضے بڑھنے لگے تھے۔ آنٹی کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے شعوری طور پر اُن کا رویہ اپنے شوہر کے لیے کافی ہتک آمیز ہو گیا تھا۔ جلد ہی دوسرا اٹیک پڑا اور اس بار وہ تاب نہ لا سکے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میّت اُٹھنے کی تیاری ہونے لگی۔ قریبی لوگ آخری بار چہرہ دیکھنے کے لیے بلائے گئے۔ رونے، گریہ کرنے کی آوازیں ایک بار پھر تیز ہو گئیں۔ بیٹیوں پر باپ کی موت کا گہرا اثر تھا۔ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے اُن کے پپوٹوں پر ورم سا آ گیا تھا۔ آنسو تو آنٹی کے چہرے پر بھی تھے مگر افسردگی یا غم سے بے نیاز۔ اس طرف کے لوگوں کی اُن پر کوئی توجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے مائکے والوں سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھیں۔ کثیر مجمع تھا۔ لوگوں نے مسجد کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو مسجد کے پاس آ کر رُکنا بھی ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بھی وہ اندر جانے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ میّت کے پلنگ پر محاصرہ کر کے گفت و شنید میں مصروف ہو گئے۔ کچھ لوگوں کی باتوں کا موضوع دنیا میں قوم پر ہو رہے جبر اور بربریت بھی تھا۔

کچھ دیر میں نماز ختم ہو گئی۔ بیٹوں نے آ کر پلنگ کے چاروں کونے سنبھالے اور شبیر چچا اپنے آخری سفر پر روانہ۔۔۔ اچھے خاصے وہ لوگ جو معذور یا مجبور نہیں تھے پھر بھی قدموں کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے ٹھہر کر چند ساعتیں گزارتے ہیں اور پھر طے شدہ پروگرام کے تحت اپنی سواریاں، جسے پہلے ہی کہیں آڑ میں چھپا دیا تھا۔ جنازے کے برابر سے یوں سُن سے گزر جاتے ہیں اور پھر جب تک جنازہ قبرستان نہیں پہنچتا ہے یہ لوگ اپنی گفتگو میں کئی بین الاقوامی مسئلے نمٹا چکے ہوتے ہیں۔

"اشہد اللہ۔۔۔ کے ساتھ جنازہ اُٹھایا گیا۔ ساتھ میں ایک شور بھی اُٹھا۔ آس پڑوس کی چھتوں، کھڑکیوں اور چھجوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ کاندھا دینے والے صف آرائی میں مصروف تھے۔ قبرستان یہاں سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

بزرگ لوگ آہستہ چلنے کی تلقین کر رہے تھے۔ بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے جام لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں میّت قبرستان پہنچ گئی۔ قبر تیار تھی۔ مجمع اندر آ کر بکھر گیا تھا کچھ لوگ اپنے مرحومین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے لگے تھے۔ ذرا دیر میں پٹرے بھی لگ گئے۔ مٹی ڈالنے کا سلسلہ اور اس کے ساتھ ''منہا خلقنا کُم ۔کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بھیڑ سے اُکتائے اور گھبرائے ہوئے لوگ مجمع چھٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کو کچھ دیر ٹھہر کر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس فیملی (Family) سے زیادہ قریب ہیں اور ہجوم چھنٹ جانے کے بعد اُن کی آمد کا اندراج بہتر طور سے ہو پائے گا۔ مٹی دینے کے بعد گھر والوں کو چھوڑ کر ویسے بھی کوئی قبرستان میں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ گورکن نے بچی ہوئی مٹی پھاوڑے سے سمیٹ کر لگا دی اور باقاعدہ قبر کی شکل عطا کر دی۔ امام صاحب نے اگلے دن فجر کے بعد قرآن خوانی کا اعلان کیا اور پھر مرحوم کی دُعائے مغفرت بھی کرائی۔ دور دراز یا رسمی مراسم والے لوگ رخصت ہونے لگے۔

جن کے لیے آخرت کے کوئی معنیٰ ہیں وہ قبرستان کی ہیبت سے خوف کھاتے ہیں۔ دوسروں کی تدفین میں آنا اور اس بہانے اپنی موت کے بارے میں سوچنا۔۔۔ یہ متضاد باتیں ہیں۔۔ خرم توجہ سے ایک بار نظر ڈال کر اس فرق کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ خالی وقتوں میں بے کار لگنے والے بہت سے کام کبھی دلچسپی کا باعث بھی ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی معنی خیز بھی۔۔۔ جیسے اس وقت، قبروں پر لگے کتبے پڑھنا اور اُس کے سیاق و سباق پر غور و فکر کرنا۔۔ اُس پر درج تاریخ کے حساب سے یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ کس کو کتنا وقت ہوا۔۔ نام سے اُس شخص کی آن بان اور شان کے بارے میں سوچنا۔ '' خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ کئی کتبوں پر نام کے ساتھ مرحوم بھی لکھا تھا۔ یہ اُس نے پہلے بھی کئی بار نوٹس کیا تھا اور ہر بار اُسے کتبے پر مرحوم اضافی بلکہ مضحکہ خیز لگتا ہے۔

اگلے ایک گھنٹہ میں بقیہ لوگ بھی گھروں کو کوچ کر گئے۔ سب سے آخر میں آنے والوں میں خرم اور گھر کے ہی لوگ تھے۔ گھر پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ گھر کا ماحول کافی حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔ بادل برس کر نکل گئے تھے کھلی دھوپ بکھر گئی تھی۔ گھر کی عورتیں تلاوت یا ذکر واذکار میں مصروف تھیں۔ بس اُن کے آس پاس کا ماحول تھوڑا سوگوار تھا۔ اگر بتیوں کی بھینی خوشبو، کفن و کافور کی مہک ایک اُداس سی فضا قائم کرنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ ایک پارہ لے کر خرم بھی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

شام کو کھانے کے پتیلے اور بھگونے آنے شروع ہو گئے۔ اخباروں میں لپٹی ہوئی روٹیاں۔۔۔۔ مٹھائی کے ڈبے۔۔۔۔ اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں۔ بھوک تو سبھی کو لگ رہی تھی۔ اُس پر ستم یہ کہ خوش ذائقہ کھانوں کی خوشبوئیں سخت امتحان لے رہی تھیں۔ چہروں پر اضمحلال کا غازہ پوتے لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ان کھانوں کا مقصد کچھ اور تھا مگر بنا کچھ اور دیا گیا تھا۔ خرم یہ سب کچھ بچپن سے دیکھتا آیا تھا مگر شروع سے ہی یہ اُسے مناسب نہیں لگتا تھا۔ ذرا سی دیر میں دعوت جیسا منظر ہو جاتا ہے۔ قورمہ، بریانی کے مطالبے اور شور مرنے والے کے لیے کس طرح ایصال ثواب کا سبب بنتے ہیں، یہ آج تک اُسے کوئی نہیں سمجھا سکا۔

مغرب کی نماز کے بعد باقاعدہ کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھر والے کم تھے مگر وہ لوگ جو قبرستان سے گھر واپس آتے ہیں محلے داری نبھانے کے لیے، شکم سیری کے بعد ہی انہیں لگتا ہے کہ اب تعلق کا حق ادا ہو گیا۔

اگلے روز عصر بعد فاتحہ ہو گیا۔ فاتحہ سے پہلے حافظ جی کو تلاوت اور ذکر واذکار کی تفصیلات تحریری شکل میں فراہم کروادی گئی تھیں کہ کتنے قرآن، کتنی تسبیحات۔۔۔۔ کلمے۔۔۔۔ وغیرہ۔۔۔۔ آخر دعا بھی ہو گئی۔ بقیہ لوگ بھی اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگے۔ خرم اور اُس کے گھر والے بھی رات گئے واپس آگئے، البتہ ابا وہیں رُک گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مجھے اپنی آرام نہیں دیکھنی ہے۔ میں ابھی یہیں رکوں گا ویسے

بھی میرا جی نہیں لگے گا؟ سب نے اُن کی خواہش کا احترام کیا۔ ویسے بھی آنے جانے کا سلسلہ تو ابھی کافی دنوں تک قائم رہے گا۔ ابا کے ساتھ رُکنا تو خرم بھی چاہتا تھا مگر اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ جمیلہ چچی کے بعد بھائی جان کے دم سے بھی بہت کچھ سلامت تھا۔ مگر اب منظرنامہ تبدیل ہو چکا ہے۔ لڑکیاں اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں۔ آخر کتنے دن رکیں گی۔ باپ کی محبت میں پھیرے لگا لیتی ہیں۔ بھائی ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے۔ خارجی دیواروں کی تعداد کم تھی مگر ناز کرنے والا یہ گھر مرغیوں کے ڈربہ جیسا ہو گیا تھا۔ دو چچاؤں کا کنبہ ساتھ رہ کر بھی اپنوں سے بہت دُور تھا، اپنی ایک الگ دُنیا بسائے بظاہر بہت مطمئن بھی۔

خرم اُن میں سے کسی کے کام کا نہیں تھا۔ اس کے اشارے اُسے کافی پہلے مل چکے تھے۔ یہ لوگ بھی سکندر اور شوکت جیسے تھے۔ ابھی تازہ معاملہ ہے۔ صرف ایک آدمی نہیں مرا ہے۔ کسی کے وجود کو گوارہ کرنے کی رواداری صرف کچھ گھنٹوں یا دنوں پر محیط ہے۔ پھر کون کس کے یہاں جائے گا۔ یہ وقت اور طرح کا ہے۔ یہاں کے تمام مکین اس رمز کو اپنے پرُکھوں سے بہتر جانتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ خوش فہمی ہے یا دھوکا۔۔۔؟

اگر بتی اور کافور کی ملی جلی مہک خرم کے ساتھ اُس کے گھر تک آ گئی تھی۔ مضمحل۔۔۔۔۔ افسردہ۔۔۔۔۔ بہت دیر سے خود پر قابو کیے ہوئے تھا مگر جھٹ پر اپنے کمرے میں آ کر ضبط کھو بیٹھا۔ دہاڑیں مار مار کر رویا۔۔۔ بہت دیر تک رویا۔۔۔ کمرے کے باہر گھر کے دیگر افراد جمع ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ رونے کی آواز تیز۔۔۔ اور تیز ہو گئی۔

●●●

مہر النساء نے ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ عطیہ نے بھڑے ہوئے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کوئی اُٹھ کر دروازے تک جاتا اُس سے پہلے ہی وہ دروازہ سرکا کر اندر آ گئیں۔ اُن کے اور خرم کے منہ سے ایک ساتھ سلام کی آواز آئی۔ کسی نے تیز تو کسی نے خاموشی سے جواب دیا۔

"آؤ۔۔۔ عطیہ۔۔۔ خیرت سے ہو۔۔۔؟ ادھر کئی دن سے ہم تمہیں یاد بھی کر رہے تھے۔"

"آپا جی، یاد تو ہم بھی کر رہے تھے مگر گھر کے بکھیڑوں سے نکل ہی نہیں پاتے ہیں۔ پان ختم ہو گئے ہیں۔ کل پان دریبہ جانا تھا مگر نہیں جا پائے۔ پہلے ایک پان لگا دیں۔۔۔" خرم کی ماں نے مصلّٰی سمیٹ کر چوکی کے ایک کونے پر رکھا اور دوپٹے کی گرہ کھولتی ہوئیں چوکی پر اپنے طریقے سے بیٹھ گئیں۔ "خرد ذرا پاندان تو ادھر سرکا دے۔ اور سب خیریت تو ہے۔ بڑے دنوں بعد نکل پائیں۔" اور اس کے بعد دونوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ عطیہ اگر عجلت میں ہوں گی تو ڈیڑھ گھنٹے میں چلی جائیں گی۔ نصف گھنٹہ کھڑے ہونے کے بعد بات کرتی ہیں اور ہر پانچ منٹ میں یہ بتاتی رہتی ہیں کہ فرصت سے کسی وقت آئیں گے ابھی تو کھڑے کھڑے ہی آئے تھے۔ آپا جی کو دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔

عطیہ بی پانچ بہنوں میں دوسرے نمبر کی تھیں۔ گھر کے پیچھے والے مکان میں تقریباً تین دہائی قبل جب یہ کنبہ رہنے کے لیے آیا تھا اُس وقت خرم کی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ تب سے اب تک وہ اماں کی زبانی یہ اور اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سُنتا آ رہا ہے۔ ان پانچ بہنوں کا اکلوتہ بھائی تھا۔ اُس کا نمبر تین بہنوں کے بعد آتا ہے۔ تمام بچوں میں ایک سے ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ دو برس کا وقفہ کسی میں نہیں ہو پایا۔ میٹرک سے ماسٹرس تک کی اُردو کی طالبات گھر پر تھیں۔ یکے بعد دیگرے سب کو اردو سے ایم۔ اے کرنا تھا۔ اپنی خواہش کے اظہار کا حق ابا نے اس کے بعد رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

اُوپر کی تین بی ٹی سی کر کے سرکاری اُستانیاں لگ گئیں۔ بقیہ دو بھی قطار میں تھیں۔ خرم اُن کے والد کی دوراندیشی کا قائل ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں اقلیتی طبقے میں تعلیم کا رُجحان اتنا نہیں تھا۔ نسوانی تعلیم کی صورتِ حال تو خاصی تشویشناک تھی۔ سرکاری اسامیاں حاصل کرنا اُس وقت کوئی معرکہ فتح کرنے جیسا نہیں تھا۔

پانچوں بہنوں کی آوازیں بہت شاکے کی تھیں۔ اُن سب کو زیادہ بولنے کا شوق بھی تھا۔ اخبار اردو ڈائجسٹ پڑھنے کی وجہ سے زیادہ ذہین اور قابل ہونے کی خوش فہمی تھی۔ ویسے کسی بات پر مشکل سے اتفاق کرتیں مگر اس بات پر سب متفق تھیں کہ وہ عام لڑکیوں جیسی نہیں ہیں۔ گھر پر جب سب موجود ہوتیں تو چڑیوں کے جھنڈ کی طرح اس قدر شور کرتیں کہ کسی کی بات کسی کو سمجھ میں نہیں آتی۔ ابا کی آمد پر خاموش ہوتیں یا اذان ہونے پر۔

کوئی اگر کسی ایک سے مخاطب ہو اور یہ چاہتا ہو کہ وہی گفتگو کرے، مگر یہاں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک اک کر کے سب مخل ہوتیں کب اپنی حکایت یا قضیہ اُس مباحثے میں شامل کر لیتیں کوئی جان ہی نہ پاتا۔ ایسا کوئی واقعہ، حادثہ کسی کے ساتھ وقوع پذیر ہوا اور وہ اُس سے پہلے اُن میں سے کسی کے ساتھ نہ گزر چکا ہو۔

یہ لوگ خود کو قاضی اور سیّد کے ساتھ نجیب الطرفین بتاتے بلکہ جب تک سامنے والے سے تسلیم نہیں کروا لیتے نہ انہیں قرار آتا اور نہ اُن کے جدِّ امجد کو۔ اُس وقت ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے کا رواج عام تھا تو یہاں بھی دن بھر آمد و رفت رہتی۔ ''کچھ پکایا ہو تو دے دیجیے۔'' اس طرح پڑوس سے ہنڈیا مانگنے کا چلن تھا۔ کٹورے میں آٹا، چاول، دال، شکر، چائے کی پتی غرضیکہ جسے جو ضرورت پیش آ جائے۔ وہ کسی پڑوسی سے بے دھڑک مانگ لیتا تھا۔ اس سے کسی کی عزت پر حرف نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا۔

قاضی سبحان صاحب کی اہلیہ اور آفت کی ان پرکالاؤں کی والدہ کو خانم کہا جاتا

تھا۔ وہ بالکل گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ شروع میں تو کسی نے اتنی توجہ نہیں کی۔ وقت کے ساتھ چیزیں خود واضح ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کی زبانی باتیں باہر نکلیں کہ یہ ہم جیسی نہیں ہیں۔ ہر وقت میک اپ میں یا بجے سنورے رہنا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اُس پر شک کیا جائے مگر خانم کی عادت واطوار بہت مختلف تھے۔ شہر تبدیل کر لینے سے سرشت نہیں بدلتی۔ جلد ہی معتبر ذرائع سے خبر کی تصدیق ہوگئی اور تفصیلات بھی معلوم ہوئیں۔ وہ طوائف کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ نانی تک باقاعدہ محفلیں آراستہ ہوتی رہی تھیں مگر اس کے بعد خانم کی ماں اور خود وہ شادی کر کے گھر داری میں مصروف ہوگئیں۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ خانم کی بیٹیوں میں ایسے کوئی اثرات نہیں تھے۔ خرم کو یاد ہے کہ ضعیفی میں بھی اُن کے سنگار کا شوق کم نہیں ہوا تھا۔ کاجل، لپ اِسٹک بھی لائنر کے ساتھ استعمال کرتی تھیں۔ آنکھیں اب بھی غیر ارادی طور پر عشوہ سازیاں کر جاتیں۔ غالب کو تو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا مگر سعیدہ خانم کو ہمہ وقت میک اَپ نے۔ چہرے کے اثرات کتنے دیرپا ہوتے ہیں، کلائی بھر بھر کے چوڑیاں ۔۔۔ شوخ اور چنچ رنگ کے ملبوسات۔ قاضی صاحب کا وہاں آنا جانا تھا اور وہیں ایک دن زیرِ دام آگئے گو کہ زندگی بھر خود کو بہت اچھا شکاری سمجھنے کی خوش فہمی سے باہر نہ آسکے۔

خرم کو وہ زمانہ بہت اچھی طرح تو نہیں مگر کچھ باتیں اور واقعات یاد رہ گئے گا ہے بگاہے تذکرہ کے سبب وہ یادیں مندمل ہونے کے بجائے زیادہ واضح ہوگئیں۔ اماں نے اُسے اُردو پڑھنے کی غرض سے اُن کے یہاں جانے کا فرمان جاری کر دیا۔ اُس کی تو نیند ہی اُڑ گئی۔ پڑھائی کے نام سے وہ بھاگنے والا بچہ نہیں تھا مگر اماں نے رتّی بھر بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا۔ کوئی ماں اتنی پتھر دل تو نہیں ہو سکتی۔ خرگوش نما بچے کو بلیوں کے نرغہ میں ڈال دیا تھا۔ پانچ میں سے تین سند یافتہ اُستاد تھیں۔ فی الحال ابھی دونوں چھوٹی والی اسناد سے محروم تھیں مگر خرم کی نظر میں وہ زیادہ اُستاد تھیں۔

خرم کے پڑھنے کے لیے مغرب کے بعد کا وقت طے ہوا تھا۔ یہ سُن کر جان

اور ہلکان ہوئی۔ شام کو سب موجود ہوتیں مگر اُس کے وہم وگمان میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ پانچوں بیک وقت پڑھائیں گی۔ ایک نے کچھ بتایا تو دوسری کے پاس اگر رد کرنے کا جواز یا کوئی اطلاع نہیں ہوتی تو وہ کلموں سے متعلق کوئی بات چھیڑ دیتی۔ تیسری کہتی کہ ابھی سے کلمہ نہ شروع کراؤ۔۔۔ اور اُن دونوں میں مباحثہ شروع ہو جاتا۔ عطیہ قاعدہ اُٹھا کر خرم کو دیتی اور کہتی کہ اب جاؤ۔۔۔ کل آنا۔۔۔'' کتاب سینے سے دبائے دروازہ سے نکلنے تک وہ اُن چیخوں کی آوازیں سُنتا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ عطیہ بھی چوکی کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی خرم انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اب ادھیڑ ہو چلی تھیں۔ سامنے کے خاصے بال سفید نظر آرہے تھے۔ حالاں کہ وہ کلر لگائی تھیں مگر اس وقت چاندی چمک رہی تھی۔ سب سے بڑی بہن نفیسہ تھیں۔ کئی برس پہلے ایک بیماری میں وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ عطیہ کے شوہر ایک سڑک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ شادی کے صرف پانچ سال ہی ہوئے تھے۔ اُن کے پاس ایک بیٹی تھی جسے لے کر وہ مستقل طور پر مائکہ آگئیں۔ خود کفیل تھیں اس لیے فیصلہ لینے میں کسی سے رائے مشورہ بھی نہیں کیا ویسے بھی لوگ انہیں مشورہ دینے میں احتیاط برتتے تھے۔ دو بہنیں شادی ہو کر دوسرے شہروں میں جا بسی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں یا کسی خاص موقعوں پر ہی آتی تھیں۔ تیسرے نمبر کی سفینہ جو سرکاری ٹیچر تھیں اور ساتھ میں ہی رہتی تھیں۔ انھوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے کسی سے محبت کرتی تھیں۔ کسی وجہ سے اس سے شادی نہ ہو سکی تو پھر یہ ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اُس آدمی سے وہ ابھی تک رابطے میں ہیں۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے۔ اس معاشقے کے آغاز میں خرم نے بھی کچھ معاونت فرمائی تھی۔ جب وہ اردو پڑھنے جاتا تھا تو سفینہ نے اُسے اعتماد میں لے کر ایک مُڑا تُڑا رقعہ دے کر سڑک پر کھڑے جس لڑکے کو دینا ہے، اُس کا حُلیہ بتایا اور ضروری ہدایات دیں کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ کسی سے کچھ بتانا بھی نہیں ہے۔ ورنہ سبق یاد نہ ہونے کے بہانے زور کی

پٹائی لگے گی۔ یہ دھمکی زیادہ کارگر ہوئی۔ پھر وہ اُن کا قاصد بن گیا۔ اس کے عوض میں اُسے کھانے پینے کی خوب چیزیں فراہم کی جاتیں۔ اُن کاغذوں میں اردو میں جانے کیا لکھا ہوتا۔ وہ تو الف دو جیر اَن پڑھ رہا تھا۔ تجسس بہت تھا کہ ایسا کیا لکھ کر دونوں ایک دوسرے کو دے رہے ہیں جو کسی اور کو نہ معلوم ہو۔ کئی بار اُس نے کاغذ کھول کر بھی دیکھا تھا۔ ایک بار سُرخ گلاب کی پتیاں اور ایک بار مور پنکھی رکھی ہوئی ملی۔ ایک دفعہ لال سیاہی سے ہونٹوں کے نشان بنے تھے۔ اس نشان نے خرم کو بہت دنوں تک پریشان کیا۔ یہ کس کے اور کیوں ہیں۔۔۔؟ کسی سے دریافت نہ کر پانے کا کرب زیادہ تکلیف دہ تھا۔ بے ایمانی اور بددیانتی اُس وقت بھی خرم کے مزاج میں نہیں تھی۔

عطیہ آنے جانے کی روایت کو اب بھی قائم کیے ہوئے تھیں گو کہ زیادہ بولنے کی وجہ سے لوگ گھبراتے تھے مگر اُن کے خلوص اور نیک نیتی پر کسی کو شک نہیں تھا۔ کسی کی کوئی بات ہو، عطیہ بی اپنا قصہ ضرور شامل کر لیتیں۔ اُن کے حافظے پر حیرت بھی ہوتی۔ خوبیاں، خامیاں تو سب میں ہوتی ہیں مگر اُس وقت کے لوگ بہت محبت کرنے والے تھے۔ بے نقط بولنے پر کسی کو ناگوار کتنا ہی گزرے، چہرے کے تاثرات سے بھی ناگواری کا اظہار نہیں ہوتا۔ بڑے بھی عطیہ بی سے یہ کہنے میں کہ ’’بیٹا اب سُستا لو تھوڑی دیر۔ گلا خشک ہو گیا ہو گا تھوڑا پانی وغیرہ پی لو۔‘‘ لحاظ رکھتے تھے۔ ناپسندیدہ لوگ بھی کس قدر اعتبار والے ہوتے تھے۔۔۔؟

●●●

مامو منکشف الحق اپنے بڑے بیٹے فرقان کے ساتھ بنیے کی دُکان پر کچھ سودا سلف خریدنے آئے تھے۔ نقد خریدنا تھا اس لیے چہرے پر جو افتخار تھا وہ اُن کے مزاج سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے شکل کسی حد تک مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ بچے نے چاکلیٹ کی ضد کی تھی۔ کوئی شریف آدمی گھر سے بلا کر اُن کی جیب میں کچھ پیسے ڈال گیا تھا۔ مامو اتنے خوش ہوگئے تھے کہ رسماً بھی منع نہیں کر سکے بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں پوچھ سکے کہ آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتے ہیں؟ جواب دیے بغیر وہ مسکرا کر رخصت ہوگئے۔ مامو نے جیب سے رقم نکالی تو اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ اُن کی توقع سے کہیں زیادہ تھے۔ دیوار کی طرف منہ کر کے دو تین بار گنے۔ ہر بار آنکھیں حیرت میں اور زیادہ پھیل جاتیں۔ اُن کے اوپر کھڑکی سے ایک لڑکا ویڈیو بنا رہا تھا۔ وہ ان سب سے بے خبر، اپنی ہی اُدھیڑبُن میں مصروف رہے۔ دس ہزار روپے کی بڑی رقم کہاں اور کیسے خرچ کریں گے یہ تو بعد میں سوچا جائے گا فی الحال انھوں نے کئی جگہ حفاظت سے رکھ لیا۔ فوری طور پر سب کا منہ میٹھا کرانے کی غرض سے فرقان کو لے کر باہر نکلے تھے۔ ارادہ تھا کہ واپسی میں مہنگی والی دودھ کی برفی بھی لیں گے اور تبھی پیسوں کے بارے میں بھی بتائیں گے۔ فرقان نے جس چاکلیٹ پر اُنگلی رکھی تھی، مامو نے دکاندار سے اُس کی قیمت دریافت کی۔ قیمت سُن کر وہ اُچھل گئے۔ ”اتنے میں تو ایک کلو گوشت آجاتا ہے۔؟“

”مامو۔ تو وہیں لے جائیں برخوردار کو اور تھوڑا سا اپنے لیے بھیجا بھی لے لیجیے گا۔ بچے کی خوشی زیادہ اہم تھی اور پھر اس وقت پیسہ تو مسئلہ ہی نہیں تھا۔ چند لمحہ ٹھہر کر کچھ سوچا۔ چاکلیٹ دوبارہ اُٹھا کر الٹ پلٹ کر جانے کیا دیکھا پھر دکاندار سے مخاطب ہوگئے۔ ”بھائی۔۔۔ یہ فری (Free) کیا ہے۔۔ اس کے ساتھ۔۔۔ یہ یہاں لکھا ہے۔“ باقاعدہ دکاندار کو ریپر پر دکھایا بھی۔

”کولسٹرال اور شوگر فری ہے؟“ (Cholestrol اور Sugar) مامو کی جبیں پر کچھ فکر سی اُبھری۔ ”تو۔۔۔۔۔ دیتے۔۔۔ کیوں نہیں؟“

"کیا۔۔۔؟" اب دکاندار بھی تھوڑا فکر مند دکھا۔

"وہی۔۔۔ جو بتا رہے ہو۔۔۔ جب فری ہے تو دیو گے نہیں"۔ اب تک دکاندار صورتِ حال سے واقف ہو گیا تھا۔ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ فرقان کی توجہ کہیں اور ہو گئی تھی اس لیے معاملہ کی تہہ تک پہنچے میں اُسے تھوڑا وقت لگا لیکن فوراً ہی اُس نے ابا کے کان میں کچھ کہا۔

"اماں۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔۔۔ یہ کمپنی والوں کو انگریزی میں مذاق سُوجھتا ہے۔ نہ چھوٹا دیکھیں نہ بڑا۔۔۔ خجالت مٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جلدی سے پیسے ادا کیے اور یہ۔۔۔ جا۔۔۔ وہ۔۔۔ جا۔

گھر میں داخل ہوئے تو ہاتھ میں پاؤ بھر برفی کا ڈبہ اور چہرے پر کچھ شرمندگی تھی۔ بیٹے کے سامنے رُسوا ہوئے تھے یہ بات زیادہ اکھر رہی تھی۔ یہ جو آج بھرے بازار عزت پہ بٹا لگا ہے، اسے ختم کرنے کی تدابیر پر غور و خوض چل رہا تھا۔ ہتھے والی کرسی پر کسی دانشور کی طرح بیٹھے تھے۔ صحن سے ہی پورے گھر پر نظر ڈالی۔ فرقان پڑھائی میں مصروف نظر آیا۔ ماموا اپنے بیٹے کی ہوشیاری سے خوب واقف تھے۔ وہ کتابیں پھیلا کر اس طرح بیٹھتا تھا کہ دیکھنے والے کو یہی لگتا تھا کہ پڑھ رہا ہے مگر کب کتابوں کے بیچ میں سے موبائل نکل آتا، کوئی جان نہیں پاتا۔ ایک بار پکڑے جانے کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ باپ خواہ ماموجیسا بے ضرر اور معصوم ہو مگر ہوتا تو باپ ہی ہے۔ وہ اب فرقان پر خاص توجہ رکھتے۔ بے نیازی کا مظاہرہ کیے رہتے اور اس کی ٹوہ بھی لیے رہتے۔ بچے بھی آج کل کے کم چالاک نہیں بلکہ اکثر تو شاطر ہوتے ہیں ورنہ پہلے کے زمانوں میں تو ماموجیسے زیادہ پیدا ہوتے تھے۔ صرف محبت کرنے والے۔ بغض و عناد سے دور۔

ماموآج خوش تو بہت تھے اور جانے کیا منصوبے بنا رہے تھے مگر فرقان نے رخنہ ڈال دیا تھا۔ موڈ تھوڑا سا بگڑ گیا تھا۔ آج سرِ بازار کسی نے اُن کی فہم و فراست پر سوال قائم کیا تھا۔ وہ تب تک اس بے عزتی کا انتقام نہیں لے لیتے، اُن کے مضطرب دل کو چین

نہیں پڑے گا۔ تبھی اچانک ذہن میں بات آئی کہ بڑا پڑھا کو بنا پھرتا ہے۔ اس کو اس کے ہی میدان میں خوار کرتا ہوں۔ اس وقت انہیں صرف بدلہ یاد تھا۔ وہ یہ یاد نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ جسے غنیم جاں سمجھے بیٹھے ہیں، دراصل وہ اُن کا ہے کون۔؟

چند لمحوں میں خود کو ذہنی طور پر تیار کیا پھر چھوٹے والے کو حکم دیا کہ ''جاؤ تم بھی اپنا بستہ لے کر آؤ۔ دیکھیں کیا تیر مار رہے ہو''۔؟ کہنے کو تو کہہ دیا مگر فوراً ہی غلطی کا احساس ہو گیا کہ یہ کیا غضب کر بیٹھے۔ انہیں یاد آ گیا تھا کہ اُن کی تعلیم تو بڑی واجبی سے تھی بلکہ واجبی بھی کیا۔ اسکول کا تو منہ بھی نہیں دیکھا کبھی۔ صرف مدرسے میں قرآن پڑھنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہیں اردو کے حرف شناس ہو گئے۔ بس دستخط کر لیتے ہیں مگر کسی ایسی جگہ جہاں یہ لگے کہ دستخط باریکی سے دیکھے جائیں گے تو وہاں کوشش کرتے کہ انگوٹھے سے کام چل جائے۔

چہل قدمی کرتے ہوئے جیسے امتحان کے دوران کلاس میں اُستاد ٹہلتے ہیں، بالکل اسی انداز میں فرقان کے پاس آئے۔ کرسی کھسکا کر پاس ہی بیٹھ گئے۔ ''میں آج تم لوگوں کا امتحان لیتا ہوں۔؟'' دونوں بچوں نے جتنی حیرت ممکن تھی، اُس کا اظہار کیا۔

''آپ ہماری بکس (Books) پڑھ لیں ۔۔؟'' فرقان نے کہہ بھی دیا۔ جواب دینے کے بجائے اُسے گھور کر دیکھا۔

''ہمارے ملک کی دارالحکومت کہاں ہے۔۔؟'' سوال کے ساتھ خود بھی سراپا سوال بن گئے۔

''دارالحکومت ۔۔۔۔ مطلب ۔۔۔؟'' چھوٹے والے نے بڑی مشکل سے دہرایا۔

''راجدھانی کیپٹل (Capital) ۔۔ جواب مجھے دینا تھا یا ریحان کو۔۔۔''

درست جواب سننے کے بعد ماموں کی تیوریاں اور چڑھ گئیں۔ ''راجدھانی ہی کیوں۔۔۔ شتابدی کیوں نہیں۔ جو پوچھا ہے سیدھے سے اُس کا جواب دو۔''

''دہلی۔۔۔'' اس بار ریحان بولا تھا۔ صحیح جواب پا کر وہ اندر ہی اندر برہم ہو رہے تھے۔ خفگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا تو مقصد فوت ہوا جا رہا تھا۔ اُن کے پاس تو سوال بھی نہیں تھے مگر جس طرح سے سماں باندھ دیا تھا تو کچھ تو پوچھنا ہی تھا۔

''سورج کہاں سے نکلتا ہے؟'' یہ اُن کا اگلا سوال تھا۔ دونوں بچے برجستہ ہنس پڑے۔

''ایسٹ سے (East)'' فرقان نے جواب دیا۔

''ایسٹ کیا ہوتا ہے، اردو میں بتاؤ۔'' ماموں نے رعب گانٹھا۔

''اردو میں مشرق کہتے ہیں مولی (مولوی) صاحب نے بتایا تھا'' ماموں دل ہی دل میں مشرق کے ہجے کرنے لگے۔ یہ کیسے پتہ چلے کہ جواب درست ہے یا غلط۔ وہ مغرب کے مقابلے مشرق سے کم مانوس تھے۔ فرقان کی خود اعتمادی سے انہیں لگا کہ ٹھیک ہی ہوگا، پھر مولی صاحب کا حوالہ بھی آ گیا ہے۔ مغرب سے وہ اس لیے واقف تھے کہ سورج مغرب میں ڈوبتا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو اس وقت کی نماز کو مغرب کی نماز کہتے ہیں۔ مشرق کی تو کوئی نماز ہے نہیں۔ خود سے ہی نبرد آزما ہو رہے تھے۔ ماموں کی عقل و خرد کی شاہراہ بہت لمبی تو تھی نہیں۔ کچھ دور چل کر سانس اُکھڑ جاتی۔ اس وقت بھی تذبذب میں تھے۔ برخوردار کا جواب درست ہے اس کی تصدیق بھی ضروری تھی۔ اُن کو کوئی آسانی سے سمجھا بھی نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ماموں کی دل آزاری ہو۔

ماموں کے پاس ابھی تک سورج کے پورب سے طلوع ہونے کی اطلاع تھی مگر اُن کے بیٹے نے اُفتاد پیدا کر دی تھی۔ ماموں کو ایک ترکیب سُوجھی۔ خود کو اپنی مسجد میں قبلہ کی طرف منہ کر کے خیالی طور پر کھڑا کیا۔ اس کے بعد بہت احتیاط برتتے ہوئے اس صورت حال میں باہر نکلے کہ مبادا کسی سے ٹکرا نہ جائیں اور نہ یہ تصوراتی منظرنامہ منتشر ہو۔ وہاں سے گھر تک خود کو ہاتھ کا پھپھولا بنائے ہوئے آئے کہ اس وقت گھر میں وہ جس سمت منہ کیے بیٹھے ہیں، وہ کیا ہے۔ مشرق یا مغرب میں ہی سے کوئی ہے یا کوئی

اور۔ سمتوں پر اس زاویے سے شائد ہی کسی نے سوچا ہو۔ آخر کار وہ اپنی فتح پر مطمئن ہو گئے۔ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائے بھی۔ بچے مسکرانے کی وجہ سے ناواقف۔ خود اپنی ہنسی روکے بیٹھے ہیں۔

''جواب صحیح ہے۔۔'' کافی دیر بعد وہ گویا ہوئے۔ ''اچھا یہ بتاؤ گائے ہمیں کیا دیتی ہے۔۔''؟ گویا ابھی اُن کے پاس اور سوال تھے۔ ان کے بچپن میں شائد اسی طرح کے سوالات پوچھے گئے تھے تو اس کے علاوہ وہ بھلا کیا جانیں۔۔؟ اس سوال پر مگر بچے اپنی ہنسی نہیں روک سکے۔

''کیا۔۔ابا۔۔۔آپ بھی۔۔۔آپ کو سوال کرنے بھی نہیں آتے۔ ماموں کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے بچکانہ سوال ہیں۔ ایک بار پھر خجل ہوئے۔

''ابا ایک میرے سوال کا جواب اب آپ دیجئے۔'' فرقان نے بنا تمہید کے اُن سے کہا۔ ماموں کو لگا کہ ابھی اور ذلیل ہونا باقی ہے۔ وہ کس منہ سے کہتے کہ ''نہیں دوں گا۔۔''

''پوچھو۔۔۔؟'' کہہ تو دیا مگر سانسیں کچھ رفتار میں آ گئیں۔

''بچے۔۔۔کہاں سے آتے ہیں۔۔؟'' فرقان کے چہرے پر نہ کوئی شرم نہ لحاظ۔ ماموں کے تو طوطے اُڑ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، یہ بھی سوال ہو سکتا ہے اور ان کی اولاد اُن سے پُوچھنے کی جسارت کر سکتی ہے؟ چودہ طبق تو روشن ہو ہی گئے تھے۔ ایک لمحہ کو ٹھہر کر یہ سوچا کہ یہ سوال ہو سکتا ہے اُسی سیاق وسباق میں کیا گیا ہو جس میں وہ دریافت کر رہے تھے۔ یعنی خالص بچوں والا۔ یہ تجسس تو اوائل عمری میں سب کو ہوتا ہی ہے۔ کہیں انہیں جواب معلوم تو نہیں۔۔؟ اس خیال کے ساتھ ماموں کی آنکھیں اور پھیلیں۔ وہ یاد کرتے ہیں کہ اپنی شادی تک انہیں کتنی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ حالاں کہ انہیں خوش فہمی ہے کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔

بچے کہاں سے اور کیسے آتے ہیں۔ جب اُن پر یہ عقدہ کھلا تو وہ اپنے ہم زلف

سے متنفر ہو گئے۔ اُن کی نظر میں وہ سخت مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ بڑی لمبی شرعی داڑھی۔ پنج گانہ کے پابند۔ نہایت ایماندار اور شریف آدمی۔ ذہن یہ بات قبول کرنے کو راضی نہیں کہ اتنا نیک اور پارسا آدمی وہ سب کچھ بھی کر سکتا ہے جس سے بچے کی تخلیق ممکن ہے۔ آٹھ بچے تھے اُن کے۔ اب ہم زلف کے لیے ماموں کی حیرت اور نفرت کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ابھی تک تو ماموز وجین کے اختلاط کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ گناہِ کبیرہ تھا۔ اُن کی بیگم کلثوم بانو نے آہستہ آہستہ انہیں یہ تمام باتیں سمجھائیں۔ فرقان کی ولادت ماموں کی شادی کے پانچ سال بعد ہونے کی وجہ کچھ اور نہیں تھی۔

ماموسوال میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ جواب دینے سے مکرنا بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اور دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ بیچ میں اگر یہ سوال معصومانہ ہے تب تو دیا ہی جانا چاہئے۔ ہم جواب نہیں دیں گے تو پھر کون دے گا۔ ''بیٹا فرقان، بچوں کو رات میں فرشتے لے کر آتے ہیں اور جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو ماں کو اُٹھا کر اُن کی گود میں ڈال دیتے ہیں۔ پریاں بھی فرشتوں کے ساتھ آتی ہیں۔۔۔۔اور۔۔۔۔''

''آپ سچ تو نہیں بول رہے ہیں ابا۔۔ یہ جھوٹ موٹ کی کہانی ہے۔''

''یہ تم سے کس نے کہا۔۔؟'' ماموبحث پر آمادہ تھے۔

''کہے گا۔۔۔۔کون۔۔۔؟'' مجھے معلوم ہے۔۔'' دیدہ دلیری سے وہ بولا۔

''گویا تمہیں یہ معلوم ہے کہ بچے کیسے اور کہاں سے آتے ہیں۔۔؟'' رُک رُک کر کسی طرح ماموں نے جملہ مکمل کیا۔ حیرت پر قابو کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے۔

''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ کیسے نہیں آتے ہیں۔۔'' فرقان بالکل نئے رُوپ میں اپنے باپ کے سامنے تھا۔

''استغفراللہ۔۔۔'' کہہ کر ماموں دوڑنے کے سے انداز میں گھر سے باہر نکل گئے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ترقی کی دوڑ میں خود کو اپنے بڑوں

سے زیادہ ذہین اور ہوشیار سمجھنے والے ان بچوں کو نہیں معلوم کہ شکست و۔فتح کے اس کھیل میں درحقیقت جیتا کون ہے۔۔۔اور ہارا۔۔۔کون ہے۔۔۔؟

اُس رات ماموبہت دیر سے گھر واپس آئے۔ چہرے پر بہت افسردگی طاری تھی۔اتنی بڑی رقم ایک اجنبی اُن کی مدد کے لیے دے گیا تھا۔وہ کتنے خوش تھے۔جشن منانے کے موڈ میں تھے۔۔۔وہ تو کسی کو بتا بھی نہیں پائے۔اتنے پیسے تھے کہ کچھ خواہشات بھی پوری ہو جاتیں۔گھر آ کر کسی بیمار کی طرح پلنگ پر گر پڑے۔ بیوی نے کھانے کا پوچھا تو بہانہ کر کے منع کر دیا۔بیویوں کو بھی شوہروں کی رگ رگ کے بارے میں پتہ ہوتا ہے۔کلثوم نے کریدا تو پوری بات بتادی۔۔۔"یہ تعلیم۔۔۔دی جا۔۔۔رہی ہے انہیں" بیگم معاملہ کی نزاکت سمجھ رہی تھیں۔اپنے طور پر سمجھانے اور بات بنانے کی کوشش کی۔

کلثوم بانو۔۔میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھے احمق سمجھتے ہیں۔میرا مذاق بھی اُڑاتے ہیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک آدمی تم نہیں تلاش کر پاؤ گی جو منکشف کو برا کہنے والا ہو۔یا مجھ سے نفرت وحقارت کرتا ہو۔صرف۔۔۔ایک آدمی نہیں ملے گا۔۔۔" بیگم تحیر سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔یہ۔۔۔کون سے ماموہیں۔۔۔آج تک کبھی اس طرح کی گفتگو نہیں کی۔۔بچوں کے لیے وہ اتنی معمولی سی بات تھی۔کہہ کر وہ بھول بھی گئے۔ان کا تو بچپن ہی ختم کر دیا۔مجھے تو وقت کی رفتار کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔۔۔ہم کہاں۔۔نکل آئے ہیں کلثوم بانو۔۔۔"ماموخاموش ہو گئے۔۔۔چھت کے گھومتے پنکھے کو دیکھے جا رہے تھے۔۔وہ بھی پاس میں گھٹنے موڑے اور اُس پر سر رکھے ماموکو تکے جا رہی تھیں۔ ماموکی آنکھ کے کنارے سے آنسو ٹپک کر گال پر آ گئے۔۔۔؟

●●●

تمام ارض وسما، سیاروں کے ساتھ وقت بھی گردش میں تھا۔ دُنیا کا تمام فلسفہ، منطق وغیرہ پڑھ کر گزری ہوئی ایک ساعت کو حال میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور گہری سیاہ، اُداس رات خرم کے سامنے تھی۔ وہ چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ موبائل میں دل نہیں لگا تو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ اب لوگ بہت دیر سے سوتے ہیں اور صبح بھی دیر تک سوتے ہیں۔ پہلے جیسا وقت نہیں رہا جب کھیا فجر کی اذان سن کر سب کو اُٹھا دیا کرتا تھا اور صبح سے گھروں میں رونقیں، برکتیں دکھائی دینے لگتی تھیں۔ اُن یادوں پر ماتم کرنے والے ختم ہو رہے ہیں۔ بہت وقت نہیں لگے گا جب شائد ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

نیند خرم کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ وہ کبھی دائیں تو کبھی بائیں کروٹ بدل رہا تھا۔ شبیر چچا کی موت کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے۔ خرم ابھی رنج وملال کی اُس کیفیت سے باہر نہیں نکلا تھا۔ چچا سے متعلق اُس کی یادیں اور موت کی سفاکیت۔۔۔ ایک سچائی بھی تو ہے۔ بعد از مرگ کیا ہونے والا ہے۔ موت کے اسرار پر سوچنا کسی نتیجے پر پہنچے بغیر شکست مان لینا، کہ یہ بھی ایک صداقت ہے۔ بھائی جان کی موت سے اُس کی بھوک پیاس کم ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت صرف موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جس کا جو مذہبی عقیدہ ہے اُسی کے مطابق راستے بنتے بگڑتے ہیں۔ بنا کچھ مزید جانے ایک دن اُسے بھی مر جانا ہے۔ خرم نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اُسے لگا کہ شائد بھوک کی وجہ سے اُسے نیند نہ آ رہی ہو مگر نیند تو اُس کے ساتھ اس طرح کا مذاق آئے دن کرتی ہے۔

شبیر چچا بھی اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک اور روشن باب سیاہ ہو گیا۔ وہ زندہ تھے تب بھی مہینوں ملاقات نہیں ہوتی تھی مگر امکانات تو باقی تھے۔ اب وہ اُمید بھی ختم ہو گئی۔ اب کبھی نہ مل پانے کا احساس ایک نئی معنوی شدت کے ساتھ بعض اوقات اُس میں شوریدگی پیدا کر دیتا۔ جذبوں کی ترجمانی کوئی کسی پر کیسے کر سکتا ہے، لفظ تو صرف اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ ابھی کل تک ایک اچھا بھلا انسان ہمارے ساتھ تھا۔ ہنس بول رہا تھا

مگر اب نہیں ہے اور کبھی واپسی بھی ممکن نہیں۔ خوش ہونا یا افسردہ، یہ کیسے بتایا جانا ممکن ہے۔ بھائی جان کی موت کا اُس پر گہرا اثر تھا۔ وقت ہی سب سے بہتر مرہم ہے۔۔۔کون جانے کتنا وقت لگے گا اس شہرِ ذات کے آشوب سے نکلنے میں۔۔؟ موبائل اُٹھا کر اُس نے ایک بار پھر وقت دیکھا۔۔اُف۔۔اب تو نیند آجائے۔اُس نے ایک بار پھر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں بلکہ بھینچ لیں۔اُس کے بس میں ہوتا تو وہ اور پہلے سو گیا ہوتا۔نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں میں جلن سی ہوتی اور تمام دن اُونگھتا رہتا تھا۔وہ شائد اگلی چند ساعتوں میں سونے ہی والا تھا کہ کانوں میں کچھ شور سا پڑا۔ڈرا دینے والا شور۔ چیخ پکار سی آوازیں، جیسے کسی نے حملہ کیا ہو۔ایک جست میں وہ چارپائی سے کود کر منڈیر تک آیا۔کافی گھروں کی لائٹیں روشن ہو چکی تھیں۔یہ آواز کسی دوسرے محلے کی تھی۔مہیب اندھیرے اور سناٹے میں آوازیں تیز ہی نہیں ہوتیں کرخت بھی ہو جاتی ہیں۔معاملہ جو بھی ہو ظالم و مظلوم تو ذہن میں اُبھر ہی آئے۔ظاہر ہے طاقتور ظالم ہوگا۔۔اتنی رات میں غریبوں کی اس بستی میں جہاں کمزور اور مظلوم تو بہت ہوں گے مگر وہ طاقتور کون ہے؟ یہ تو معلوم کرنا ہی ہوگا۔رونے اور چیخوں کی صدائیں مزید تیز ہو گئیں۔ایک دم سے خرم کے اندر جوش سا ابھر گیا۔وہ بجلی کی سی تیزی سے نیچے کی طرف بھاگا۔نیچے بھی سب جاگ رہے تھے۔کچھ کا ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ دروازہ پر تالا لٹک رہا تھا۔اُسے معلوم تھا کہ اماں ابھی اُسے ٹوکیں گی۔کی ہولڈر (Key holder) سے اُس نے چابی نکالی اور بہت تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔تبھی اماں کی آواز کانوں میں پڑی۔۔۔''اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔۔۔پہلے ماجرا تو سمجھ لو۔۔''

''اماں اُسی کے لیے باہر جا رہا ہوں۔۔۔۔''

''تم نے ہی سب کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔تم نے پہلے بھی میری کب سنی ہے جواب سنو گے۔خرم نے آگے اماں کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔لاک اور پھر دروازہ کھولا۔

ایک بار پھر اماں کی صدا اُس کے کانوں میں پڑی۔ ''جیسا ہو فون کر کے ہمیں بھی بتا دینا اور زیادہ دیر نہیں رُکنا۔۔۔ ذرا دھیان سے۔۔۔'' یہ ماں کی ممتا تھی۔ چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے سے پہلے اُس نے اتنا سُنا۔ تیز قدموں سے اُس نے اپنی گلی پار کی۔ یہ شور ماموں کے محلّے کی طرف سے آتا ہوا لگ رہا تھا۔ وہاں ایسا کیا ہو سکتا ہے۔۔۔؟ طرح طرح کے سوال ذہن میں آ رہے تھے وہ آوازوں کا تعاقب کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا فلک شگاف چیخیں اور تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ وہاں سڑک پر قطار بند بہت سی پولیس کی گاڑیاں دکھیں۔ دل دھک سے ہو گیا۔۔۔ اللہ خیر کرے۔ بہت آہستگی سے اُس نے کہا بھی۔۔۔ اتنی تعداد میں پولیس موجود ہو تو پھر یہ گریہ وزاری کس کی اور کیوں۔۔۔؟ ایک دم سے سوال ذہن میں اُبھرا۔ یہ اطمینان تو ہو گیا کہ یہ دنگا تو نہیں ہے۔ اس کے بعد جو بات ذہن میں آئی اُس سے پورے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اتنی رات میں کسی پسماندہ اور اقلیتی بستی میں اتنے فورس کی موجودگی؟ اس کے آگے کچھ سوچنے کی تاب نہیں تھی خرم میں۔

خرم اس حلقہ کے جغرافیہ سے ہی نہیں یہاں کے ماحول اور فضا سے بھی کسی حد تک واقف تھا۔ اس محلّے میں کچھ چور، اُچکے یا چھوٹے موٹے جرائم پیشہ تو تھے مگر پولیس کا اتنا بڑا عملہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ پہلے معاملہ کی حد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ گاڑیوں کو پار کرتا ہوا بھیڑ میں زور زبردستی سے گھس گیا۔ یہ گھر تو ماموں کا ہے۔ وہ کچھ اور سوچ پاتا اُس کی نظر سامنے کھڑے آدمی پر پڑی۔ یہ تو ماموں ہی تھے۔ ایک لمحہ یقین اور بے یقین کے درمیان۔۔۔ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ پھر وہی دل خراش چیخ۔۔۔ ''بیٹا خرم۔۔۔ تم آ گئے۔۔۔ فرقان کو بچا لو۔۔۔ یہ لوگ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ اُس کے بارے میں۔۔۔'' فرقان کی ماں بھی اُس کے سامنے دہاڑے مار رہی تھیں۔ خرم کی ایسی کیفیت زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اتنی اموات دیکھیں اور ابھی تو بھائی جان کا سانحہ بالکل تازہ تھا اور اس موت نے اُسے بہت افسردہ بھی کیا مگر یہاں تاسف

کے ساتھ حیرت بھی شامل تھی۔

فرقان پولیس کی گرفت میں تھا جیسے شیر کی پکڑ میں ہرن۔ بھیڑ اُسے لے جانے سے روک رہی تھی۔ انھوں نے ابھی سختی نہیں برتی تھی۔ کسی حد تک معاملہ خرم کی سمجھ میں آچکا تھا پھر بھی اُس نے افسر سے سوال کرنے کی ہمت جتائی"۔ سر میں اس بچے کا چاچا ہوں۔ کیا میں جان۔۔۔۔۔ سکتا ہوں۔۔۔۔" خرم کا گلا رُندھا ہوا تھا۔ "ایک بار سب کو الگ الگ بتانے کی ڈیوٹی نہیں ہے ہماری۔ پھر بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آتنک وادی گتی ودھیوں میں سلپت ہے۔۔۔"

"آر۔۔۔یو۔۔۔شیور۔۔۔(Are You Sure)؟" اس بار افسر نے خرم کو زیادہ غور سے دیکھا۔

"یہ کورٹ (Court) طے کرے گا۔ میرے پاس ثبوت ہیں۔ آپ اس بھیڑ کو ہٹانے میں ہماری مدد کریں ورنہ ہمیں بل پریوگ کرنا پڑے گا۔" خرم کو معلوم تھا کہ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہوسکتا ہے لیکن وہ ماموں کو کیسے سمجھائے گا۔ اُن لوگوں کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ "گھر میں نقدی بھی برآمد ہوئی ہے جس کے بارے میں ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کسی کو پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ پیسے کہاں سے آئے ہیں"۔؟ یہ اطلاع خرم کے لیے بھی حیران کن تھی۔ ماموں کی آنکھوں نے اس بات کی تصدیق کی مگر اپنی بے چارگی اور بے گناہی بھی تاثرات ہی سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ ماموں اور فرقان اگر یہ جرم تسلیم بھی کر لیتے تو خرم کو معلوم ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ پولیس نے لاٹھیاں پٹخنی شروع کر دیں۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ آہ و فغاں جتنی ممکن تھی اتنی تیز ہوگئی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ پورا محلّہ اکٹھا ہوگیا تھا۔ سب ایک آواز میں فرقان کی بے گناہی کی بات کہہ رہے تھے اور ساتھ میں یہ بھی کہ اس کی عمر دیکھیں۔ وہ ابھی کتنا چھوٹا ہے۔ اُسے تو آتنک وادی کا مطلب بھی نہیں معلوم ہے۔ حالات اتنے خراب ہوگئے ہیں، وہ یہاں تک سوچ ہی نہیں پایا۔ بے گناہ نوجوان لڑکوں کو گھر سے اُٹھانے کے

خاصے واقعات اُس نے سنے تھے۔ اُس کے اپنے شہر میں کئی واقعات پیش آئے تھے مگر یہ آگ اُس کے گھر تک بھی آسکتی ہے اس بارے میں تو کبھی غور ہی نہیں کیا۔

چند لمحوں میں بھیڑ منتشر ہوگئی۔ وہ لوگ فرقان کو لے گئے۔ ماموں اور ان کی بیگم کافی دُور تک گرتے پڑتے۔۔۔ چھوڑ دینے کی خوشامد کرتے۔ کلثوم بانو نے تو افسر کے جوتوں پر اپنا سر تک رکھ دیا۔ لاٹھی سے اُسے دھکیل کر ہٹایا اور لے گئے۔ اُن کا زندگی بھر کا اثاثہ لٹ گیا۔ دونوں وہیں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ریحان کو کوئی پڑوسی اپنے گھر لے گئے تھے۔ گاڑیوں کا شور ختم ہوگیا تھا صرف رونے کی آوازیں باقی تھیں۔ مجمع ایک بار پھر محاصرہ کی شکل میں اُن دونوں کے پاس جمع ہوگیا۔ کچھ لوگ تسلی وتشفی کی غرض سے آگے بھی آئے مگر ایسے وقت میں جب لفظ کی حرمت بھی باقی نہ رہے کوئی کسی کے ماں باپ کو کس طرح دلاسہ دے سکتا ہے۔ محلے کے اکثر ناخواندہ لوگ کچھ نہیں کرسکتے تھے مگر ہمت افزائی کے لیے پاس میں بیٹھے تھے۔ خرم کے لیے یہ گھڑی زیادہ مشکل تھی۔ اُس کے پاس ایسے لفظ تھے نہ اتنی طاقت کہ وہ ادا کرسکے۔

کبھی کبھی لفظ اتنے بے معنی بھی ہوجاتے ہیں کہ ہم ششدر ہوکر صرف دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر خاموشی نہ ہوتی۔۔۔تو۔۔۔؟ وہ ماموں کے کچھ اور قریب آگیا۔ اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔ وہ خرم سے لپٹ کر رونے لگے۔ بہت دیر سے رونے کی وجہ سے نڈھال سے ہو رہے تھے۔ خرم کو دیکھ کر بجھتے چراغ کا جیسے پھر سے جل جانا، پتہ نہیں کہاں سے اتنی قُوت یکجا کی۔ روتے میں ماموجان نے کیا کیا کہتے رہے۔ لفظ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ زیادہ کچھ سمجھ نہیں سکا۔ وہ اُن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پانی منگوا کر زبردستی چند گھونٹ حلق میں اُتروائے۔ قدرے توقف کے بعد خرم نے لوگوں کی مدد سے دونوں کو گھر پہنچایا۔ اس اثناء میں اُس نے اماں کو فون کرکے صورتِ حال سے آگاہ کردیا اور یہ بھی بتادیا کہ وہ اب صبح ہی آئے گا۔

کوئی چائے لے کر آگیا۔ اُن دونوں کو تو دُنیا جہان کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ہلکان

ہوئے پڑے تھے۔ جب ذرا سی طاقت اور ہمت جمع ہو جاتی ۔ رونے لگتے۔ دل چھلنی کر دینے والی یہ گریہ وزاری ٹھہر ٹھہر کر جاری تھی یہاں تک کہ صبح کے اشارے آنے لگے۔ کئی بار ماموکے تعلق سے اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس شخص کو بھی روتے ہوئے دیکھنا تھا۔ اللہ نے ایسا چہرہ بنایا تھا کہ ہمہ وقت مسکراتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ خرم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ماموروتے ہوئے کیسے لگیں گے۔ اتنے برس نہ رونے کی تلافی آج ہی کرنی تھی۔

''جانے کہاں لے۔۔گئے ہیں۔۔میرے لال کو۔۔۔اللہ جانے کیا سلوک کر رہے ہوں؟'' یہ خرم کی ماں کی آواز تھی۔

''پریشان نہ ہوں، بھور ہو جائے تو چلتے ہیں۔۔۔اللہ سب بہتر کرے گا۔۔'' خرم نے اُن کی ہمت افزائی کی۔ کسی محسن کے خیر کے دو بول ایسے وقت میں کبھی تریاق بھی بن جاتے ہیں۔ کہنے کو تو خرم نے کہہ دیا تھا مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ معاملہ کتنا گمبھیر اور پیچیدہ ہے ۔جس مقصد کے تحت اُسے اُٹھایا گیا ہے تو وہ کون نہیں جانتا ہے۔ تاوان ادا کر کے باہر آنے کی صورت ہوتی تو ماموتو تب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں کچھ بھی دسترس میں نہیں۔ ماموجیسے بے یارو مددگار آدمی کے لیے مسجد کے دروازے ہی وا رہتے ہیں۔

''ماموں میں ابھی گھر ہو کر آتا ہوں۔۔۔اماں کو بتانا بھی ہے۔۔پھر چلتے ہیں۔۔۔''

ماموں نے اثبات میں آہستہ سے سر کو جنبش دی۔ ماموں اور اُن کی بیگم کے چہرے پژمردگی اور ایسی ویرانی تھی کہ دل لرز جائے جیسے یہ شخص کبھی مسکرایا ہی نہ ہو۔ خرم کے اندر زیادہ دیر تک اُن آنکھوں کے اندر جھانکنے کی تاب نہیں تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔ ذہن میں بہت سارے سوال اُبھر رہے تھے۔ ''پولیس فرقان کو کہاں لے جا سکتی ہے۔ اُس کے ساتھ سلوک کا تو تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ ماموں کے گھر سے کیش برآمد ہونے کی خبر زیادہ تشویشناک تھی۔ ابھی واپس آ کر پہلے ماموں سے اس بارے میں استفسار کرے گا۔ یہ معمہ وہ اپنے طور پر حل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ سب سے مشکل سوال تھا کہ فرقان زندہ واپس

آپائے گا۔۔؟'' یہ سوال وہ کسی سے دہرا نہیں سکتا تھا مگر یہ سچائی تو تھی ہی۔ خرم کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اللہ ہی غیب سے کچھ اسباب بنا دے۔۔۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ اماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مضطرب و بے چین اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ''اتنی دیر سے خرد سے کہہ رہی ہوں کہ خورشید سے میری بات کرادے مگر میری کون سنتا ہے۔۔؟''

فرقان کے متعلق کچھ دریافت کرنے سے پہلے خرم نے پوری روداد بیان کردی۔ بہتوں کے لیے یہ ایک خبر تھی بس مگر خرم کی والدہ اس میں شامل نہیں تھیں۔ ماموں سے انہیں بھی بڑی اُنسیت تھی وہ اکثر اُن کے پاس آجاتے تھے۔ اماں بھی اُن کی باتوں پر مسکرائے بغیر نہ رہ پاتیں مگر اس وقت دل گرفتہ ہوگئیں تھیں۔ اُن کا منہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ اماں کو جب زیادہ حیرت ہوتی یا رنج کا اظہار کرنا ہوتا تو اُن کا منہ تھوڑا سا کھلا رہ جاتا۔ آپ خرد سے کہہ کر چائے بنوادیں یا کچھ ہو تو کھانے کو دے دیں۔ مجھے ابھی فوراً جانا ہے۔

''اب کہاں جانا ہے۔۔۔؟'' سوال کر کے اماں نے منہ بند کرلیا۔

''ماموں کو لے کر فرقان کی تلاش میں۔۔'' خرم نے جواب دیا۔ اماں نے خرد کو آواز دی اور بھائی کے لیے ناشتہ کا کہا۔ خرم ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے واش روم (Wash room) کی طرف چلا گیا۔

حالاں کہ فریش (Fresh) ہونے میں اُسے بہت وقت نہیں لگا مگر تب تک خرد ناشتہ لگا چکی تھی۔ خرم نے جلدی سے زہر مار کیا۔ آج اماں کا رویہ خاصہ مثبت دکھا۔ ''اماں ۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ اب۔۔۔''

''اللہ۔۔۔۔ حافظ۔۔۔۔'' اماں نے کچھ پڑھ کر پھونکا بھی۔

''اللہ حافظ''۔۔۔ خرم نے بھی کہا اور گھر سے باہر نکل آیا، اماں کے اس طریقے نے خرم کے حوصلوں میں مزید اضافہ کردیا۔

●●●

کچھ وقفے کے بعد وہ پھر سے ماموں کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ دروازے پر کئی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تمام رات آس پڑوس کے لوگوں نے ماموں کی دلجوئی کی اور چائے پانی کا بندوبست بھی کیا۔ اس وقت بھی کسی نے ناشتہ کا انتظام کیا تھا۔ وہ لوگ کسی طرح کھانے کو تیار نہیں تھے۔ خرم نے دھمکی دی کہ اگر وہ نہیں کھائیں گے تو پھر ہم فرقان کی تلاش میں کہیں نہیں جائیں گے۔ خرم جانتا تھا کہ یہ حربہ کارگر ثابت ہوگا اور ایسا ہوا بھی۔

چند گھنٹوں میں ماموں اور اُن کی اہلیہ کلثوم بانو کا منہ نکل آیا تھا اس کے علاوہ جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ رو رو کر بے دم سی ہو گئیں تھیں۔ آنکھیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ خرم کو دیکھ کر اُن دونوں کی آنکھوں میں ایسی چمک سی دکھی جیسے صحرا یا دجنگل میں بھٹکے ہوئے کو کوئی دوسرا نظر آ جائے۔ لاشعوری طور پر کچھ ہمت بندھ جاتی ہے۔ ''ماموں میں چاہ رہا ہوں کہ ہم لوگ دو رکعت نماز پڑھ کر نکلیں۔ اللہ ہی کرنے والا ہے۔ اُس سے طلب کرتے ہیں۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ضرور۔۔۔بہتر خیال ہے۔۔۔'' ماموں نے فوراً حامی بھری۔ خرم یہ بھی چاہتا تھا کہ یہ لوگ اب روئیں نہیں اور اس کے لیے اسے بہت سمجھداری سے کام لینا تھا۔ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکل جائے کہ اُن کا صبر وضبط ٹوٹ جائے۔ کچھ دیر بعد یہ منظر تبدیل ہوتا ہے۔ خرم ماموں کے ساتھ اُس تھانے کے سامنے کھڑا ہے جہاں فرقان کے ہونے کے امکان نہیں ہیں مگر چوں کہ یہ اُن کے علاقے کا تھانہ ہے۔ کوئی خبر یا سراغ انہیں یہاں سے مل سکتا ہے۔ ابھی سب سے پہلا مرحلہ تو یہ معلوم کرنا ہی تھا کہ بالآخر فرقان ہے کہاں اور اُس پر کیا چارجز لگے (Charge) ہیں۔

اُن کے ساتھ ماموں کے کچھ عزیز اور چند محلے کے لوگ بھی آئے تھے۔ خرم دو تین لوگوں کو ماموں کے ساتھ لیکر اندر گیا۔ باقی لوگوں سے باہر ہی رکنے کا کہا۔ خرم نے دیوان کو پوری تفصیل بتائی۔ وہ سوال پر سوال کرتا رہا۔ پھر بہت دیر بعد یہ بتایا کہ یہاں کوئی خبر نہیں ہے اور ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہار کر تھانیدار کے کمرے میں گئے

وہاں پھر سے وہی کہانی دہرائی۔ علاقے کے کچھ اور لوگ باہر جمع ہو گئے تھے۔ شائد بڑھتی بھیڑ کی وجہ سے تھانیدار کی تیوریاں چڑھ گئیں تھیں۔ اُس نے بھی ٹالنے کی کوشش کی مگر یہ ضرور بتا دیا کہ اُسے ATS نے اُٹھایا ہوگا۔ وہ کہاں لے گئے، یہ آسانی سے معلوم نہیں ہوتا۔ مجمع نے نعرے بازی شروع کر دی۔ پولیس ایسے تو تماشہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بڑھتی بھیڑ کو تھانے کی چہار دیواری سے باہر کھدیڑا گیا۔ سڑک پر افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا اور سڑک پر جام بھی لگ گیا لیکن تھوڑی دیر میں پولیس کی مشقت سے آمد و رفت شروع ہو گئی۔

اب گیٹ کے باہر ایک بے بس ولاچار باپ جس کے بے قصور بیٹے کو پولیس نے اُٹھا لیا اور اُسے یہ تک نہیں بتایا گیا کہ وہ ہے کہاں۔۔۔؟ ایک درخت کے نیچے وہ بٹھا دئے گئے تھے۔ قریبی رشتہ دار جو ساتھ آئے تھے، اُن کے پاس ہی کھڑے تھے۔ کچھ سُراغ ملے تو اگلے امکان کے بارے میں سوچیں۔ کتنی دیر یہاں بھوکے پیاسے بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ دو چار یا دس گھنٹہ۔۔۔ اُس کے بعد۔۔۔؟ خرم بہت فکر میں تھا۔ پیسوں کی تنگی کی وجہ سے معاملہ زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ماموں کی ہمت بڑھانے کے لیے مسلسل جھوٹ بول رہا تھا پھر خاموش ہو جاتا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ خاموشی ہزار بلائیں ٹالتی ہے مگر جب خود عمل کرنا پڑے تو یہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

کچھ گھنٹوں کے بعد وہ لٹے پھٹے گھر واپس آ گئے۔ گھر میں گھستے ہی دونوں ایک ساتھ پھر رونے لگے۔ دیواروں پر بھی سفیدی کے بجائے خوف و ہراس نظر آ رہا تھا۔ آپ کسی سے محبت کرتے ہیں اور ایسے وقت میں جب اُسے آپ کی ضرورت ہو اور آپ کچھ نہ کر سکیں۔۔۔ یہ کرب کیا لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

خرم کے اندر اب کچھ کہنے کی تاب باقی نہیں تھی۔ اندر سے وہ بھی مسمار ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے بڑی خوش فہمی تھی کہ اس کو بات کرنے کا تھوڑا سا سلیقہ اور شعور ہے مگر آج لگا کہ ایسا نہیں ہے۔ الفاظ اپنے معنی و اثر کھو چکے تھے۔ رہ رہ کر وہ خاموش ہو جاتا مگر وہ تو

اور زیادہ اذیت ناک تھی۔ ''میں ابھی آتا ہوں دس منٹ میں۔۔۔'' جیسے تیسے اُس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر باہر آ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اگر وہ مزید ایک لمحہ بھی یہاں اور رُک گیا تو وہ بھی رو دے گا۔ خرم کے نکلتے ہی وہ دونوں کسی کٹے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑے۔۔۔ دونوں خوب روئے۔ آنسو اور آواز کے بغیر۔ جب دل روتا ہے تو اشکوں کی محتاجی نہیں دیکھتا۔ ذرا ہی دیر میں ہچکیاں سی آنے لگیں ایک ماں کی فریاد ہو سکتا ہے عرشِ معلیٰ تک پہنچ گئی ہو۔ بس یہاں کی پولیس تک بھی پہنچ جائے۔۔۔؟

دونوں ایک بار پھر بے دم اور نڈھال سے ہو گئے تھے۔ صبح سے بھوکے بھی تھے۔ پلنگ پر دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں اور سانسیں چل رہی تھیں۔ وقفے سے ہچکیاں بھی آ جاتیں۔ گلے خشک ہونے کی وجہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ پانی کی بہت حاجت کے باوجود اُٹھنے کی تاب نہیں تھی۔ رات سو نہ پانے کی وجہ سے پپوٹے بھاری ہو گئے تھے بلکہ ورم سا آ گیا تھا۔ چند منٹوں بعد خرم واپس آ گیا۔ ماموں نے اشارے سے پانی طلب کیا۔ اُس کے ہاتھ میں کھانا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ لوگ کل سے بھوکے ہیں۔ خرم نے کھانے کا پیکٹ کنارے رکھ کر پہلے اُن دونوں کو پانی پلایا۔ اُن کی حالت دیکھ کر یہ لگ رہا تھا کہ اگر ذرا دیر انہیں پانی اور نہ ملا تو شاید وہ بچ نہیں پائیں گے۔

کھانے کے لیے وہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔ خرم کو بڑے جتن کرنے پڑے۔ انہیں بچوں کی طرح سمجھایا کہ اگر کھانا نہیں کھائیں گے تو اور کمزور ہو جائیں گے۔ آپ سے چلا نہیں جائے گا۔ پھر فرقان کو تلاش کرنے کیسے چلیں گے۔ یہ ترکیب کام کر گئی اور جیسے تیسے کچھ لقمے اُن کے حلق میں اُتر گئے۔ وہ دونوں خرم کے عزم اور محبت کے آگے ہار گئے۔ رشتہ میں تو خرم اُن کا بہت دور کا کچھ تھا، شائد اصل رشتے کی جانکاری دونوں کو نہیں تھی مگر جو تعلق اور وابستگی تھی اس سے زیادہ کون کسی سے چاہتا بھی ہے۔ ماموں اور ان کی اہلیہ کی آنکھوں میں ہلکی سی جو بھی اُمید کی رمق تھی، وہ خرم کے ہی دم سے تھی۔

''کیا فرقان نے کھانا کھایا ہوگا۔۔۔؟'' معاً فرقان کی ماں نے خرم سے یہ سوال

کیا۔ وہ ایک دم سے سکپکا گیا۔ جو بات اُسے نہیں معلوم اُس کا جواب وہ کیسے دے پاتا۔ جھوٹ بولنے کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھا مگر چند لمحوں میں ہی اُس نے خود کو آمادہ کرلیا اور انہیں اطمینان دلا دیا کہ ضرور کھالیا ہوگا۔ وہاں کھانے پینے کا انتظام رہتا ہے۔" انہیں یقین تو آ گیا مگر اُس کے بعد اُن سے مزید کھایا نہیں گیا۔ اور پھر سے دونوں کی آنکھوں نے غل مچانا شروع کر دیا۔ اُسے کچھ اور وقت اُن کے ساتھ گزارنا پڑا۔ خیر کے بول اور ہمت افزائی سے تھوڑا فرق بھی پڑا۔ اُس کے کچھ اپنے کام اور ضروریات بھی تھیں جس کے لیے اُسے گھر آنا تھا۔ سمجھا بجھا کر اور جلد واپس آنے کا کہہ کر وہ پھر سے اپنے گھر کے لیے نکل پڑا۔

خرم راستے میں بہت زیادہ افسردہ اور مایوس تھا۔ چہرے پر کسی لمبی مسافت کی تھکن، جیسے زادِ راہ سفر میں لُٹ گیا ہو۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ اُس کے سامنے رہ رہ کر فرقان کا چہرہ گھوم جاتا۔ کس قدر بھولا اور معصوم بچہ۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اسی سال تو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا ہے۔ اس کی شکل آوٹ فوکس (Out Focus) ہوئی تو ماموں یا ان کی بیگم کی صورت اُبھر آئی۔ خرم کو یاد ہے کہ اس سے پہلے اُس نے کبھی ماموں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ وہ تو ایک ایسی زعفرانی شخصیت تھی کہ اُن کی باتیں خوشبو کی طرح سامنے والے کو معطّر کر مسکرانے کے لیے مجبور کر دیتیں۔ اُداس اور مغموم لوگ بھی ماموں کی حرکتوں یا بھولے پن پر خود کو زیرِ لب مسکرانے سے نہیں روک پاتے تھے۔ ایسا معصوم اور قلندر صفت آدمی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔؟

وہ گھر میں داخل ہوا۔ اماں ہمیشہ کی طرح چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اماں نے ماموں کی خیریت دریافت کی۔ اُس نے اختصار کے ساتھ اماں کو بتا دیا۔ اماں نے اپنا کی پیڈ (Key Pad) والا موبائل اُٹھا کر خرم کی طرف بڑھایا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے شاکرہ کا فون آیا تھا مگر بات نہیں ہو سکی۔ کبھی کبھی یہاں پر نیٹ ورک (Net Work) کام نہیں کرتا ہے۔ تُو ذرا اپنے فون سے ملا کر میری بات

کرادے، خرم نے اپنا فون نکال کر نمبر ملایا اور فون اماں کی طرف بڑھا دیا۔ ''رِنگ جا رہی ہے بات کیجئے۔''

''ہیلو۔۔۔ہاں۔۔۔شاکرہ۔۔۔میرے فون میں شائد کچھ خرابی ہے یا نیٹ ورک کی وجہ سے وہ کمبخت نہیں ملنے دے رہا تھا تو میں نے خورشید سے کہا کہ اپنی خالہ سے بات کرادے''۔ اتنا سن کر خرم آگے بڑھ گیا۔ اُسے واش روم (Wash room) جانا تھا۔

دس منٹ بعد خرم منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا۔ اماں کے پاس ٹھہر کر یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ فون کتنی دیر میں اُس کے ہاتھ لگے گا۔

''ہاں۔۔۔تو آجاؤ۔۔۔ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔۔اے بچی حالات کی وجہ سے اب تو کہیں جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ٹھیک ہے۔۔۔آؤ۔۔۔ہم انتظار کرتے ہیں۔اللہ حافظ۔۔۔اور سنو۔۔۔کھانے وانے کے چکر میں نہیں پڑنا۔دیر ہو جائے گی۔کھانا یہیں کھانا۔۔۔ٹھیک ہے۔۔وعلیکم السلام۔۔۔''اماں نے بات ختم کر کے فون خرم کی طرف بڑھایا۔ اُس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ ماموں کی خیریت پوچھنے میں اتنی سرد مہری کیوں تھی۔ خانہ پوری ضروری تھی۔ دھیان تو سارا بہن کی طرف لگا تھا۔ ایک دم سے خرم کے ذہن میں ایک بات آئی کہ اگر یہ ہمارے سگے ماموں ہوتے۔۔۔تو۔۔۔؟'' وہ فون لے کر صحن کی طرف آجاتا ہے۔ رشتوں کی گتھیاں اور ہر گرہ میں کچھ نہ کچھ عبرت۔ خونی رشتے بھی اب اتنے بے معنی ہو گئے ہیں کہ اب بھی یقین کرنے میں تردد ہوتا۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا درد نہیں معلوم؟ بے خبری یہاں نعمت نہیں بن پائی۔

وہ بچپن سے ہر بات کو غور سے سنتا تھا۔ ہر رشتے کی معنویت اور اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ زندگی میں بہت سے سوال کسی سے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وقت ہر سوال کا بہتر جواب دیتا ہے۔ ننھیال اور ددھیال سے تعلق یا ترجیحات یکساں نہیں تھیں۔ پہلے ابا زور بازو سے اپنی طرف والوں کے حقوق دلوا دیا کرتے تھے پر اب صورت حال

ویسی نہیں ہے۔اب اقتدار ماں کے پاس ہے۔ جہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ خرم کو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ابا کی آمدنی قلیل تھی۔ پیسوں کی تنگی کی وجہ سے ہماری ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں مگر ابا کا رعب اور اُن کی اہمیت ویسی نہیں تھی جیسی آج کے صاحب خانوں کی ہے۔ کسی کی مجال تھی کہ ابا کے سامنے اونچی آواز میں بات کرلے یا نظر ملا کر لب کشائی کرے۔عزت واحترام کا ایک مرتبہ وہ بھی تھا۔

آجکل وہ ایک کونے میں پڑے دن بھر کھوں کھوں۔ کرتے رہتے ہیں۔ تپائی پر دواؤں کا ڈھیر۔اب تو ابا کو اپنے حقوق اور اختیار بھی یاد نہیں۔ جب خاتون خانہ گھر کی مکھیہ نہیں ہوتی تھیں تب یہ رشتوں کا میزان صحیح وزن بتاتا تھا۔نہ کسی کی طرف کم نہ کسی کی طرف زیادہ۔

گھر میں فراوانی نہیں تھی اور یہ سب عام تھا۔چند لوگ ہی خوشحال ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں اماں کوئی موقع چوکتی نہیں تھیں۔ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اُسے ہی دوڑایا جاتا۔۔۔کوئی پوٹلی۔۔۔تھیلا۔۔۔یا پلیٹ۔۔۔۔کٹورا۔۔۔اماں چوری چھپے اُسے تھماتیں اور یہ ہدایت بھی دیتیں کہ کسی سے بتانا نہیں۔ کوئی پوچھے تب بھی نہیں۔۔۔بس اُلٹے پاؤں واپس آئے۔۔۔" اس وقت تک خرم کو امانت اور خیانت کا فرق نہیں معلوم تھا۔ یہ تو اس کے بھائی بہنوں کا حق مارا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ کھیل اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوا، اماں کی طرف سے اُس کی بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اُسے معلوم ہوا کہ ماں کی طرف سے بدگمان ہونے کا اُس کے پاس اختیار ہی نہیں ہے۔

اُس زمانے میں گھر میں کوئی خاص چیز کھانے کی اگر آجاتی تو گھر والوں کو ہی پوری نہیں پڑتی۔ کسی اور کے یہاں کیسے بھیجی جاسکتی تھی وہ بھی ابا سے چھپا کر۔۔۔۔؟ اس بات کے لیے وہ اپنے آپ کو کبھی مطمئن کر ہی نہیں پایا۔ بہت عرصہ تک خرم ان سوالوں کا بوجھ اپنے دماغ میں چڑھائے رہا۔ کم گو ہونے کی وجہ سے اُس نے کبھی کسی سے ان باتوں کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی باتوں کے عمل، ردِّ عمل۔۔۔۔یا اہمیت سے

وہ واقف نہیں تھا مگر دل گواہی دے دیتا تھا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔۔۔؟

''تم نے بتایا۔۔۔۔نہیں۔۔۔'' اماں کی آواز پر وہ چونکا تھا۔

''کا ہے۔۔۔کا؟ حزم نے تھوڑی سی حیرت کا اظہار کیا۔

''ماموں کے یہاں گئے تھے۔۔۔کچھ پتہ چلا کہ نہیں۔۔'' اُن کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ابھی تو کچھ نہیں ہوا ہے اور فی الحال اُمید بھی نہیں ہے۔'' حزم کی آواز سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ایسے کسی کو بھی گھر سے اُٹھا لے جائیں گے اور جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیں گے۔۔؟''

''ہاں۔۔۔۔اماں۔۔۔اب ایسا ہی ہے۔جرم تو کیا ہے اُس نے بلکہ ثابت بھی ہو گیا ہے۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟ وہ بری طرح چونکی اور انھوں نے حیرت کا اظہار بھی کیا۔

''اس کی شکل سے تو نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام بھی کر سکتا ہے۔کس پر بھروسہ کریں۔ویسے کیا کیا تھا اُس نے۔'' انہیں لگا کہ معتوب کرنے سے پہلے جرم بھی معلوم کر لیا جائے۔حزم نے امّاں کو کوئی جواب نہیں دیا۔

''بتا تا کیوں نہیں ہے کہ کیا کیا ہے لونڈے نے۔۔؟'' وہ تھوڑا سا برہم ہوئیں۔

''اگر اب بھی آپ کو نہیں معلوم ہے کہ فرقان کا کیا جرم ہے تو میں؟ حزم رُک رُک کر بول رہا تھا۔اماں کو لگا کہ یہ کوئی معنی خیز بات کر رہا ہے۔اُن کا آدھا دھیان بہن کی آمد کی طرف تھا لیکن حزم کے گفتگو کے انداز سے وہ ذرا ٹھٹھکیں اور پھر عقدہ اُن پر کھل گیا۔چہرے پر طاری سراسیمگی اس بات کا ثبوت تھی۔چند لمحوں کی گہری خاموشی، اگر رات ہوتی تو گھڑی یا اور ایسی ہی کمزور آواز ہی سنائی دے جاتیں۔اس وقت دونوں کو نہیں معلوم ہے کہ کیا بولنا ہے اب۔۔۔یہ بہت دیر کا نوحہ تھا بھی نہیں۔اماں کو بہن کے آنے کی بات پھر یاد آ گئی۔

''تم ذرا مسیتے کے یہاں سے ایک کلو بہت عمدہ سا گوشت لے آؤ۔۔۔'' اماں نے پاندان کے اندر سے اپنا بٹوا نکالا اور اس میں سے مُڑے تڑے نوٹ نکال کر خرم کی طرف بڑھائے۔۔۔۔ دیکھ لینا خصّی ہی کاٹا ہے۔۔۔ کبھی کبھی یہ بھی کام دکھا دیتا ہے۔ اماں کو معلوم ہے کہ خرم خراب گوشت کبھی نہیں لاتا۔ ضرورت بھر کی اُسے معلومات ہے مگر ہر بار وہ اُسے بہتر گوشت لانے کے لیے تلقین ضرور کرتیں۔ خرم سے ہی خصّی، پٹ وغیرہ کے نام سنے اور اب اسی پر رعب گانٹھتی ہیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ پھر سے مسکرا دیتا مگر اندر اتنی تیز گرم ہواؤں کا شور تھا کہ یہ تنی معمولی سی خواہش بھی اُسے ترک کرنی پڑی۔ خرم نے اماں کو پیسے دینے سے منع کیا۔ جب اُس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے اُس وقت بھی اُسے تکلف ہوتا تھا، اب تو خیر وہ خرچ کر سکتا تھا۔ اماں نے خرم کی بات پر توجہ نہیں دی اور پھر سے پیسے آگے بڑھا دیئے یہ کہتے ہوئے کہ ''میری بہن آ رہی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میرے ہی پیسوں سے گوشت آئے۔'' اس جملے کے بعد وہ کچھ نہیں بولا اور اس نے روپے پکڑ لئے۔

''پکنا کیا ہے۔۔۔؟ خرم نے دریافت کیا۔

''قورمے کا گوشت چاہئے۔'' اماں نے فوراً جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

مسیتے کی دُکان شہر کے وسط میں واقع ہے۔ یہ بہت قدیمی دُکان ہے ایک تختی پر یہ دعویٰ لکھا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسیتے کے دادا نے یہ دکان تقسیم کے بعد شروع کی تھی اور خرم کے دادا نے تب ہی سے وہاں سے گوشت لینا شروع کیا تھا۔ تین پیڑھیاں بدل گئیں مگر دکان تبدیل نہیں کی۔ اتنے برسوں کے مراسم اور خرم کو گوشت کی سمجھ۔ وجہ جو بھی ہو مگر اس گھر کے لیے ہمیشہ سب سے بہتر گوشت دستیاب ہوتا۔ خرم کو صرف یہ بتانا ہوتا کہ پکنا کیا ہے۔ اُسے اُس کی پسند کے مطابق مل جاتا ورنہ یہ معاملہ اتنا آسان ہوتا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں قصائی اپنا ہُنر دکھا ہی دیتا ہے۔ خرم کا خیال تھا کہ گوشت اور بوٹی اگر

ڈھنگ سے نہ بنی ہوں تو پکانے والا کتنا ہی اُستاد ہو، ذائقہ میں فرق آ ہی جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد خرم گوشت لے کر گھر واپس آ گیا۔ اتنی دیر میں انجم اور خرد نے گھر کی صفائی کر ڈالی تھی۔ خرم کو تیز بھوک لگی تھی مگر وہ پہلے نہانا چاہتا تھا۔ اُس کی توجہ ماموں کے گھر کی طرف لگی تھی۔ وہ جلد سے جلد فارغ ہو کر اُدھر جانا چاہتا تھا۔ گوشت کا چکر نہ چلا ہوتا تو شاید وہ اب تک نکل بھی گیا ہوتا۔ وہ غسل خانے کا رُخ کرتا اس سے پہلے کسی انجان نمبر سے اُس کے پاس کال (Call) آئی، اُس نے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ ماموں کے پڑوس میں کہیں رہتا تھا اور یہ فون انہیں کے کہنے پر کیا ہے۔ اُس شخص نے آگے بتایا کہ ماموں اُسے یاد کر رہے ہیں۔ خرم نے وجہ دریافت کی کہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ اُس نے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ خرم کا تجسس تو بڑھ ہی گیا تھا۔ اُسے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا تو اُس نے کریدا۔ ''وہ لوگ ٹھیک تو ہیں۔۔۔؟''

''میرے سامنے تو ایسا کچھ نہیں لگ رہا ہے۔ یہ لوگ پریشان ہیں نہ۔ آپ اُن کے زیادہ قریب اور ہمدرد ہیں'' شاید اسی لیے وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ آپ جلدی سے یہاں آ جائیں۔۔۔'' اُس کی اتنی باتوں سے خرم صورتِ حال سمجھ گیا تھا۔ یہ ایک اور اُس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اپنی ضرورت اور کام سے اُسے کہیں جانا ہوگا بہر حال ابھی تو چل کر دیکھا جائے کہ کیا معاملہ ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

تیزی سے اُس نے غسل کیا۔ کچھ لقمے منہ میں ڈالے اور نکل پڑا۔ اماں پوچھتی رہیں۔ ''اب کہاں۔۔۔ تمھارے جیتے گھر میں لگتے ہی نہیں۔ یہاں مہمان آ رہے ہیں اور تمھارے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ کچھ ضرورت ہو۔۔۔؟'' ''خرد سے فون کروا دیجئے گا میں کوئی راستہ نکال لوں گا۔ ویسے بھی تھوڑی دیر میں آ ہی جاؤں گا۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ ماموں کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ پردہ ہٹانے سے پہلے اُس نے ماموں کو صدا دی۔ اندر سے جواب آیا تو وہ داخل ہو گیا۔ ماموں اپنی بیگم کے ساتھ صحن میں ہی بیٹھے تھے۔ ماموں کی سسرال کی طرف کے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ خرم کو دیکھتے ہی وہ پھرتی

سے اس کی طرف آئے اور اُس کے گلے لگ کر پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔
تھوڑی دیر میں رونے بھر کی طاقت ماموں نے پھر سے یکجا کر لی تھی۔ ان کی اہلیہ کلثوم ایک طرف کو بے دم سی پڑی ہوئی تھی۔ ایسا وقت جب زبان لفظوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہو، اور الفاظ اپنی معنویت اور اثر کھو چکے ہوں تو کوئی کیا کہے۔ ایسے میں خاموشی ہی بہتر لگتی ہے۔ مگر اس کی تکلیف اور طرح کی ہے۔ اس مرحلے سے بہر حال اسے نکلنا تھا اور اس کے لیے اُسے کچھ سوچنا بھی تھا۔

''بیٹا کسی طرح کہیں سے بھی پتہ کرو کہ وہ کہاں لے گئے ہیں میرے لال کو۔ میرا تو کوئی ہے بھی نہیں۔ کس کے پاس جاؤں۔۔۔'' خرم کی قوت گویائی جیسے ختم ہوگئی تھی۔ ماموں اُسے پتہ نہیں کیا سمجھ رہے تھے۔ وہ تو انہیں کی طرح ایک عام سا آدمی ہے، جس کا کہیں کوئی اثر و رسوخ نہیں ہے۔ بس وہ ماموں سے زیادہ جانتا ہے، سسٹم کو۔۔۔ اور سسٹم چلانے والوں کو۔ تعلقات اور حیثیت پیسے سے بنتی ہے۔ اُس کا یہ خانہ بھی خالی تھا۔ اس حقیقت سے ماموں کہاں تک واقف تھے یہ اُس کو نہیں معلوم تھا مگر اسے تو ماموں کا بھروسہ اور حوصلہ دونوں ہی قائم رکھنا تھا۔ خرم سوچ رہا تھا کہ ماموں کو اس کی طرف سے شاید کچھ زیادہ ہی خوش گمانی ہے ورنہ اس کی تو گھر میں کوئی سننے والا نہیں پھر کسی غیر سے کیا توقع کرے۔۔۔ غیر بھی۔۔۔ کون۔۔۔؟ اب کہ تو معاملہ پولیس سے پڑا ہے۔ ہوں گے اچھے لوگ پولیس میں بھی۔ وہ اس بات سے انکار نہیں کرتا ہے مگر مجموعی طور سے جو اُسے معلوم ہے۔ وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایسے کسی عام آدمی کو نہیں جانتا جس کی رائے تمام یا اکثر پولیس والوں کے بارے میں مثبت ہو۔

کسی کے سینے سے لگ کر اور کچھ ہو یا نہ ہو عارضی طور پر جی ہلکا ضرور ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ سامنے والے کا ہاتھ پشت پر آ جاتا ہے۔ یہی دست شفقت ہے۔ چند جملے خود بہ خود زبان سے ادا ہوتے ہیں اور رونے والے کی دلجوئی کر جاتے ہیں۔ خرم ماموں سے عمر میں چھوٹا تھا مگر اس معاملہ میں کسی کا چھوٹا یا بڑا ہونا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ ماموں کی

ہمت افزائی کے لیے زبان سے وہ جو کچھ کہہ سکتا تھا، اُس نے کہا بھی اور فوری طور پر اس کا
اثر ماموں کی صورت پر نظر بھی آیا۔ ماموں اس معاملے کی گمبھیرتا سے کتنا واقف ہیں، یہ خرم کو
نہیں معلوم مگر وہ جانتا تھا کہ یہ معاملہ کس قدر نازک ہے اور جب پاس میں ذرائع بھی نہ
ہوں۔۔۔تو ایسی مشکل گھڑی میں کیا کرنا چاہئے۔ اُسی وقت اُس کے ذہن میں ایک
بات کوندے کی طرح لپکی۔ جن لوگوں کے پاس ذرائع ہیں اُن کے پاس تو جایا ہی جا سکتا
ہے۔ اس خیال سے اُس کے اندر تھوڑی ہمت بڑھی۔ ایسے کئی لوگوں کو وہ جانتا ہے۔ جلد
ہی اُن سے ملنا ہوگا۔ کچھ مذہبی اور فلاحی تنظیمیں فعال ہوئی ہیں اور ایسے کسی معاملہ میں
جہاں کسی بے گناہ کو پولیس یا ATS نے حراست میں لیا ہے، اُن کی ضرورت بھر مدد کرنا۔

خرم مزید ایک گھنٹہ ماموں کے ساتھ رہا۔ اس اثناء میں اُس نے دونوں کی کسی حد
تک خاصی حوصلہ افزائی کی تھی۔ تازہ جو باتیں اُس کے ذہن میں آئی تھیں اس نے وہ بھی
انہیں بتائیں۔ مقصد ان کی دم توڑتی اُمیدوں کو زندہ رکھنا تھا۔ خرم اپنے گھر کے لیے بھی
فکر مند ہو رہا تھا۔ خالہ کے آنے کی وجہ سے اس کی عدم موجودگی، گھر کا ماحول اُس کے
لیے خراب کر سکتی تھی اس لیے ان دونوں کو تسلی و تشفی دے کر اس نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔
فون نہ آنے کا مطلب ہے کہ اماں کی خفگی شروع ہو گئی ہے۔ اس عمر میں بھی وہ اماں کی
ناراضگی کو چھوٹے بچوں کی طرح لیتا ہے وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد خرم گھر میں داخل ہوا تو اماں نے خشمگیں نگاہوں سے اُس کی
طرف دیکھا۔ اُسے پہلے سے اندازہ تھا کہ آج کی خفگی میں تھوڑی راحت بھی پوشیدہ
ہوگی۔ جیسا اُس نے سوچا تھا بالکل ویسا ہی پایا، ننھیال کے کسی قریبی کے آجانے سے خرم
کا یہ بڑا فائدہ ہو جاتا ہے۔ اماں سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں
کے چہرے پر خوشی کچھ زیادہ ہی دکھ رہی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاکرہ بہن اپنی بیٹی
اور نواسی کو ساتھ لا رہی تھی۔ خوشی چوگنی تو نہیں لیکن تین گنی تو ہو ہی گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا
کہ ماں اگر ہمیشہ اسی طرح خوش رہیں تو وہ بھی خرم ہو جائے۔ وہ خالہ کے برابر میں ہی

صوفے پر بیٹھ گیا۔ شربت، پانی کا دور چل چکا تھا۔ اماں اور خالہ اپنے بچپن کی باتیں کررہی تھیں، خالہ کی بیٹی کشور اور اُن کی نواسی اسمارہ اس کے سامنے والی نشست پر دراز تھیں۔ آج کافی وقت کے بعد وہ ان لوگوں سے مل رہا تھا۔ اب ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے کا رواج بہت کم ہوگیا تھا۔ شادی بیاہ یا موت مٹی میں ہی سب اکٹھا ہو پاتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اچھائیاں اور آج کی برائیاں بیان کی جارہی تھیں۔ تذکرے میں خاندان کے کئی لوگوں کی عمر دلیل کے ساتھ بتائی گئی کہ کون کس سے کتنا بڑا یا چھوٹا ہے۔ جن سے ان کے مراسم بہتر نہیں تھے وہ بڑے ٹھہرادیے گئے بقیہ کو تو پھر چھوٹا ہونا ہی تھا۔ گو کہ اس مباحثہ میں کسی کی عمر پر مذاکرے کا کوئی جواز نہیں تھا مگر یوں بھی ہو جاتا ہے۔ اماں کے فون پر کسی کی کال آئی تو تسلسل ٹوٹا۔ شاکرہ خالہ خرم کی طرف متوجہ ہوئیں حال احوال کے بعد کام دھندے کے متعلق دریافت ہی نہیں کیا، باز پُرس بھی کی۔ اس طرح کے سوالات سے اُسے وحشت سی ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی سے نہیں پوچھتا مگر خود سے پُوچھے جانے پر نہ چاہتے ہوئے بھی جواب تو دینا ہی پڑتا ہے۔ جیسے تیسے خالہ کی بے تکی باتوں سے پیچھا چھڑایا۔ اماں کی فون پر گفتگو ختم ہوگئی تھی۔ شائد اسی لیے اُسے نجات مل گئی تھی ورنہ کون جانے اور کتنے احمقانہ سوالات اُسی سے پوچھے جاتے۔

اُس نے ایک بار پھر سے کشور اور اسمارہ کو بغور دیکھا بلکہ اس بار زیادہ دھیان اور توجہ سے دیکھا۔ لاشعوری طور پر یہ توجہ وقت کے اثرات کا جائزہ بھی لینے کی غرض سے ہوتی ہے۔ تقریباً بیس برس کے فرق سے تین شکلیں اس کے سامنے تھیں۔ تینوں کی مشابہت اور مماثلت کی اطلاع تو اسے تھی مگر یہ تینوں آپس میں اس قدر ملتی ہیں، اس کا اندازہ اُسے آج ہی ہوا۔ نواسی سے نانی تک کا سفر، وقت کا جبر کیسے پھول سے تازہ اور شاداب چہروں کی تمام آب و تاب مسخ کرکے جھرّی زدہ بنا دیتا ہے۔ چالیس برس پہلے خالہ شاکرہ بھی تو ایسی ہی رہی ہوں گی۔۔۔۔۔ اسمارہ کی طرح۔ شگفتہ معصوم۔۔۔ تر و تازہ۔۔۔۔ بلا کی خوبصورت۔ چالیس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا مگر جس کا گزر گیا،

اُسے بہت قلیل لگتا ہے جیسے ابھی چند سالوں کی ہی بات ہو۔ جس چیز کو زیادہ توجہ اور غور سے دیکھو تو تھوڑی بہت حیرانی ضرور ہوتی ہے۔ نانی سے نواسی کی مماثلت کے بارے میں اسے معلوم تھا مگر اب قریبی رشتہ داروں سے بھی ملاقات اتنے دنوں بعد ہوتی ہے کہ سب کی شکلیں محفوظ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اوائل عمری کی باتیں۔۔۔قصے۔۔۔واقعات۔۔۔لوگ پہلے کس طرح محفوظ کرلیا کرتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہو پاتا۔ جانے ایسا کیا ہوا کہ بیشتر باتیں دماغ سے محو ہو جاتی ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ گھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی کام یا ضرورت سے جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ یہاں کیوں آئے تھے بھلا۔۔۔؟ ذہن پر بہت زور دینے کے بعد بھی یاد نہیں آتا جبکہ پانچ بادام رات میں بھگو کر روز صبح کھاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ عالم ہے کہ بچپن کے کپڑوں کی تراش خراش ہی نہیں رنگ بھی معدوم نہیں ہوتے۔ دنیا کا کوئی علم اس طرح کی بہت سی گتھیوں کو اس طرح سلجھانے سے قاصر ہے کہ ذہن اُسے قبول کرلے۔ ہر آنے والی ساعت اگلے لمحہ میں ماضی ہو جاتی ہے۔ تصور میں ہم جو کچھ دیکھ یا محسوس کرسکتے ہیں، اُسے چھُو کیوں نہیں سکتے۔ اگر بے خبری کی نعمت سے مالا مال نہیں ہے تو آگے خاصی راحت ہے ورنہ ماضی کی بازیافت سے حال کے تمام خلفشار چین وسکون غارت کردیتے ہیں۔ کسی کو جاننا اور پھر بہت زیادہ جاننا، کبھی کبھی اجنبی ہونے کا احساس بھی کرادیتا ہے۔

خرم خالہ شاکرہ کے چشمے کے پیچھے نیلی آنکھوں میں گزرے موسموں کی بہار اور خزاں تلاش کر رہا تھا۔ زندگی کا تجربہ وقت کے اختیار میں ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر خالہ شاکرہ کے یہاں شروع سے پیسوں کی اتنی فراوانی ہوتی تو یہ جگنو ابھی ماند نہ پڑتے۔ انھوں نے تو اس سے زیادہ غربت دیکھی ہے پر اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ سات بیٹے تھے اور سب بہتر روزگار سے لگے تھے۔ جیسے بچپن کی یادیں ذہن سے نہیں کھرچتیں ویسے ہی وقت کی سفاکیت اور زخموں کے نشان باقی ہی رہتے ہیں۔۔۔؟

☆☆☆

آج اتوار کا دن ہے۔۔۔اتوار۔۔۔مطلب۔۔چھٹی۔۔۔اور اس چھٹی میں گھر کے کچھ افراد کے لیے پوشیدہ ہے ایک عجیب سی راحت بلکہ خوشی بھی۔ ذہن وجسم کو آرام وسکون پہنچانے کا ایک مکمل دن۔۔۔؟ اتوار سے زیادہ سن ڈے (Sunday) لطف دیتا ہے۔ اس دن گھر کے معمولات روز سے مختلف ہوتے ہیں۔ خرم کے لیے زیادہ مشکلات بھرا دن ہوتا ہے۔ اب دیر رات تک جاگنے کا چلن ہے۔ بچے کیا بڑے بھی اس وبا کی زد میں ہیں۔ ویکنڈ (Weekand) پر تاخیر کچھ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ دیر سے سونے کے سبب اٹھنے میں بھی تاخیر ہوتی ہے۔ پورے ہفتہ کی نیند اتوار کو ہی پوری کی جاتی ہے۔ اُٹھنے کے بعد بچے ہی نہیں اُن کے والدین بھی خوش اور تازہ دم نظر آتے ہیں۔ آج کے لوگوں کا اب یہی طرز زندگی ہے۔ آدھا دن گزر جانے کے بعد لوگ کمروں سے باہر آتے ہیں۔ فریش ہونے میں ایک گھنٹہ اور گزر جاتا ہے پھر سکندر باہر سے ناشتہ لاتے ہیں۔ ناشتہ کرتے وقت بقیہ دن کی پلاننگ ہوتی ہے کہ شام کو کہاں جانا ہے۔ زیادہ تکرار اس بات پر ہوتی ہے کہ کہاں نہیں جانا ہے۔ کسی رشتے دار کے یہاں تو ہرگز نہیں۔ یہ بچوں کا فیصلہ ہوتا۔

گھر میں کسی کا دیر تک سونا خرم کو نحوست کی طرح لگتا۔ جب تک لوگ بیدار نہیں ہوتے وہ ذہنی کرب میں مبتلا رہتا۔ انتظار کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا اُس کے پاس۔ رات کا بچا ہوا کچھ ہوتا تو وہ کھالیتا۔ خرد سے چائے بنوالیتا۔ صبح کی چائے تو اماں بنانے کی کوشش کرتیں مگر وہ انہیں روک دیتا اور خود ہی چائے بناتا۔ اماں کو بھی خرم کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی حالاں کہ کئی طرح کی ہنڈیا اور لذیذ کھانوں کو پکانے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ پارٹیوں میں سیکھ کر وہیں یہ شوق پورا بھی کر لیتا۔

چائے پیتے ہوئے وہ بچپن کے اتوار اور تعطیلات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اتوار تو اُس کے زمانے میں بھی آتا تھا مگر ابا کی طرف سے اس دن کے لیے کوئی

رعایت کا اعلان نہیں کیا جاتا تھا۔ ابا فجر کی نماز کے لیے جاتے تو اسے آواز لگاتے۔ خرم۔۔۔خورشید۔۔۔اذان ہوگئی ہے۔۔۔اٹھو اور مسجد آؤ۔ وہ جب تک اُٹھ کر بیٹھ نہیں جاتا اُن کی گردان نہیں رُکتی۔ اُسے لگتا تھا کہ چھٹی کے دن ابا کا یہ جبر اور زیادہ ہوتا ہے۔ اُس کی کیا مجال کہ وہ دوبارہ سو جائے۔ کوئی موسم ہو اس کا ناغہ نہیں ہوسکتا۔ ابا کے پیچھے پیچھے آنکھیں ملتا۔۔۔منہ بناتا وہ مسجد میں داخل ہو ہی جاتا۔ وہ لوگ اپنے ماں باپ سے کس قدر ڈرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے احترام اور اکرام میں لگے رہتے۔ آج کے بچے تو اکثر اپنے والدین کو جھڑک دیتے ہیں۔ پہلی بار میں تنبیہ نہ کرنے کی وجہ سے اُن کا حوصلہ بڑھتا ہے اور عادت بھی پختہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کے بعد روکنے ٹوکنے کا وقت نکل جاتا ہے۔ پہلے والدین کے سامنے اُونچی آواز میں بات کرنا تو دور چہرے پر ہلکی سی ناگواری کی ایک لکیر بھی اگر دکھ جاتی تو شام تک سکائی ہوتی رہتی۔ ماں باپ کی کوئی بات اُن کی اولادوں کو بھی بری لگ سکتی ہے؟ خرم یا اس کے دوستوں میں سے کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی۔ اُن کی تربیت میں صرف یہ بات ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ یہ اختیار صرف والدین کو ہی ہے۔

ابا کو کسی بیٹے کی نافرمانی کا شبہ بھی ہو جاتا تو اگلی چند ساعتوں میں ساری اکڑفوں جھاڑ دی جاتی۔ ابا گردن جھکا کر گُدی پر چپت رسید کرتے تھے۔ پٹائی کا وقفہ جب بھی زیادہ طویل ہو جاتا تو ابا غلطی کا انتظار نہیں کرتے۔ کبھی اس وجہ سے مارتے کہ اتنے شاطر ہو گئے ہو کہ کوتاہیاں ہمارے سامنے بھی نہیں آرہی ہیں۔ کبھی کبھار اماں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتے۔ عورتوں پر ہاتھ اُٹھانا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بیویاں بھی ہتک محسوس نہیں کرتی تھیں۔ اتنی پٹائی کے باوجود خرم کو لگتا کہ وہ وقت زیادہ بہتر تھا۔ اخلاق و محبت کے عوض تعیش کا جو سامان خریدا ہے اس کے لیے قیمت زیادہ ادا کرنی پڑی ہے۔

اتوار کو وہ اپنے خرچ سے کئی اخبار لیتا تھا۔ ضمیموں اور ادبی صفحات کا مطالعہ کر کے اُس نے اخبارات میز پر رکھے۔ اسے بھی باہر جانا تھا۔ ایک دو ضروری کام تھے۔ انہیں نمٹا کر ماموں کی طرف جانا ہوگا۔ اُٹھ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور اماں سے دریافت

کر کے کہ کچھ آنا تو نہیں ہے وہ باہر نکل آیا۔

پُرانے بازار میں ایک پارکنگ میں اپنی بائیک کھڑی کی اور چہل قدمی کرتا ہوا بازار کے اندر آ گیا جہاں سعید بھائی کا تصویر کے نام سے ایک اسٹوڈیو (Studio) تھا۔ کئی دنوں سے اُسے سعید بھائی کی بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ اسٹوڈیو کا سائن بورڈ اب وہاں نہیں تھا اگرچہ دکان کھلی ہوئی تھی لیکن سعید کے بیٹوں کی تحویل میں تھی۔ انھوں نے اس میں موبائل اور اُس سے متعلق سامان فروخت کا کام کرلیا تھا۔ خرم کا اس دکان میں خاصہ وقت گزرا ہے۔ جانے کتنی یادیں اُس کے پاس محفوظ تھیں۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی سعید بھائی کا انتقال ہوا ہے۔ اُن سے وابستہ یادیں ابھی تازہ ہیں شاید اسی وجہ سے یہاں آنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ سعید بھائی کا یہ اسٹوڈیو کبھی شعرا و ادبا کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ شہر کے تمام لکھنے والوں کا یہاں تانتا لگا رہتا تھا۔ چند لوگ جو اساتذہ کے زمرے میں آتے تھے وہ یہاں کافی دیر بیٹھتے تھے۔ کوئی ادبی شخصیت یا ادب نواز شہر آتا تو یہاں آئے بغیر اس کے سفر کی تکمیل نہیں ہوتی۔ تفریح و مذاق ہوتے۔ سنجیدہ گفتگو اور مباحث ہوتے۔ دو چار باذوق یہاں ہمہ وقت موجود رہتے۔ دُکان کھلنے سے بند ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ سعید دن بھر خاطر مدارات میں لگے رہتے۔ ہر آدھے گھنٹہ میں چائے والے کو پکارتے کبھی بسکٹ اور نمکین بھی منگوا لیتے۔ ان سب باتوں سے اُن کے کام پر منفی اثر پڑ رہا تھ۔ اس کے لیے بیوی بچوں کے جھگڑے بھی ہوتے۔ انہیں سب گوارہ تھا مگر وہ اپنے احباب کی آمد پر پابندی لگانے کو راضی نہیں تھے۔ بچے جب اُن سے پوچھتے کہ آپ تو نہ شاعر اور نہ افسانہ نگار تو پھر یہ تماشہ کس لیے۔۔۔؟

''بیٹا میں میزبان ہوں۔ میری چوکھٹ پر آنے والے وہ سب میرے مہمان ہیں۔ میرے باپ نے سکھایا تھا کہ خود بھوکے پیٹ سو جانا مگر مہمان کی ناقدری نہ ہونے پائے۔ تم لوگ شاید کبھی یہ بات محسوس نہیں کر پاؤ گے کہ پھر یہ ہماری دال روٹی اُسی دکان سے کیسے چل رہی ہے۔۔۔؟'' اس جواب کے بعد سچ میں وہ سب بہت حیران سے لگے

تھے۔ دکان پر آنے والے اتنے سارے لوگوں میں چند ایسے تھے جن سے ان کی قربت زیادہ تھی۔ آئے دن ان لوگوں کو گھر پر کھانے کے لیے بھی مدعو کرتے۔ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ خاص طرح کے پکوان پکواتے اور کھلا کر تعریفیں سنتے اور خوش ہوتے۔

سعید بھائی کے پاس بتانے کے لیے بڑے قصے تھے۔ شہر کے مشاہیر خواہ وہ قلم کار ہوں یا نہ ہوں، سعید بھائی کے پاس اُن کا کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور موجود ہوتا۔ کبھی اگر نہیں بھی ہوتا تو وہ فوراً گڑھ لیتے یا کسی دوسرے کا قصہ کسی کے نام سے منسوب کر کے سنا دیتے۔ واقعات سنانے کا اُن کا انداز لطیف اور دلچسپ ہوتا بلکہ اُن کے انداز بیاں کی وجہ سے قصہ زیادہ اثر انگیز ہو جاتا۔ اس بات پر سب یکساں طور پر متفق تھے۔ سعید بھائی اتنے سادہ لوح اور محبت کرنے والے انسان تھے کہ لوگ عش عش ہی کرتے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ زبان و بیان کی حُرمت سے وہ بہت واقف نہیں تھے مگر اخلاص کے ساتھ بے خبری میں جو غلطی سرزد کرتے۔ اُس سے ایک نیا مزاح پیدا ہو جاتا۔ خرم کا خیال تھا کہ یوسفی بھی ایسے کسی سعید کی دکان پر ضرور بیٹھے ہوں گے۔ اُن کی سادگی اور معصومیت کی وجہ سے کسی نے کبھی گرفت نہیں کی ورنہ ادب میں زبان کے ایسے بے محابا استعمال پر چوٹی بھر کی معلومات رکھنے والے بھی پانی کے اُوپر آجاتے ہیں۔ خرم نے سعید اور سعید جیسوں کو دیکھا ہے۔ سعید جیسے تو شاذ و نادر ہی بچے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں کہ زمین سے خرم جیسے بھی غائب ہو جائیں گے۔

خرم دکان کے سامنے آ گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس بازار میں یہ دکان کتنی قیمت کی ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ سعید بھائی کے باپ داداؤں کی بنائی ہوئی یہ دکان اگر آج بیچ دی جائے تو شاید تمام زندگی یہ لوگ بنا کچھ کیے دال روٹی کھا سکتے ہیں۔

خرم دکان کے مقابل کھڑا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اُداس ہو گیا تھا۔ سعید بھائی کا اپنے بیٹوں سے آخری جھگڑا اُسے یاد آ رہا تھا۔ اُس دن بچوں نے زیادتی کر دی تھی۔ اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا کہ ان کے باپ کے دوست بیٹھے ہیں۔ شاید وہ گھر سے طے

کر کے آئے تھے۔ وہی ایک ضد کی اسٹوڈیو بند کریں یا فروخت۔ فوٹوگرافی کا کام ویسے بھی موبائل نے تباہ کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر آپ کے دوست یہاں دن بھر بیٹھ کر پوری کر دیتے ہیں۔۔۔۔'' اس دن خرم نے سعید بھائی کے چہرے پر جو سراسیمگی دیکھی وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن میں کچھ بولنے کی سکت نہیں لگ رہی تھی مگر پھر جانے کیا سوچ کر وہ گویا ہوئے۔۔۔ ''جب تک میں حیات ہوں، میرے یار دوست ایسے ہی آتے رہیں گے۔۔ تم لوگوں کو لگتا ہے کہ میں اُن پر مال لُٹا رہا ہوں جبکہ میرا یقین یہ ہے کہ انہیں کی وجہ سے اللہ مجھے نواز رہا ہے۔ اسی دکان کی آمدنی سے تم لوگ پڑھ لکھ سکے ہو۔ تمھاری دو بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ تم لوگوں کو برکت کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ تمھارے دادا کا نام ہے۔۔۔۔ جنہیں تم لوگوں نے دیکھا بھی نہیں مگر وہ برکت کا خون میری رگوں میں ہے۔۔۔ ہم دونوں کی دنیا ہی بہت مختلف ہے۔۔۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔۔۔ پھر اُس کے بعد جیسے چاہنا، استعمال کرنا۔۔ جو چاہنا بیچنا ۔۔نہیں بیچو گے تو بھی کوئی مُوتنے نہیں آئے گا۔۔۔ میں بہت دن زندہ رہنے والا نہیں۔۔۔۔'' اُن کا گلا بھر آیا تھا۔۔۔ بھائی سعید کی آوازوں کی بازگشت خرم کے کانوں میں ابھی تک ویسے ہی گونج رہی تھی جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ سعید بھائی کا چہرہ اُس کے ذہن کے اسکرین پر چلنے لگا۔ وہ دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دونوں لڑکوں نے اسے دیکھا وہ پہچان گئے تھے اس لیے سلام بھی کیا۔ تاثرات سے خوشی یا گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اُسے ایسے ردِ عمل کی توقع تھی بھی۔ ٹھہر کر اُس نے اپنے جذبوں پر قابو کیا۔ سعید بھائی کا ذکر زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ اُسے لگا تھا کہ اُن کے بارے میں ان لوگوں سے بات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ موبائل کے بارے میں اُن سے رائے مشورہ کرنے لگا۔ ضرورت نہ ہونے پر بھی ایک دو چیزیں خرید لیں۔ دُکان کے اندر آ کر بنا کچھ لیے چلے جانے کی وہ ہمت نہیں کر پایا۔ سعید بھائی کی زندگی میں بات اور تھی۔ چند روپیوں کی خریداری پر لڑکوں کے چہروں پر در آئی کرختگی سی کچھ کم ہو گئی تھی۔

''کام وغیرہ کیسا چل رہا ہے تم لوگوں کا۔۔۔؟'' آخر کار وہ گویا ہوا۔ خرم کی نظریں اُن مقامات کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں کبھی ادب کی بڑی اور عظیم شخصیات کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ تو فریم کی ہوئی تھیں۔ وسط میں میز کے اُس طرف سعید بھائی کرسی ٹیڑھی کیے بیٹھے ہوتے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ دورانِ گفتگو کرسی تھوڑی سی پیچھے کو جُھکا لیتے اور داہنے ہاتھ سے ریک کو پکڑے رہتے کہ کہیں توازن بگڑے اور وہ گر نہ جائیں۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس کی ڈبیا وہیں میز پر دھری ہوئی تھی۔ وہ خود بھی بیڑی بہت پیتے تھے اور دوستوں کو بھی پلاتے تھے۔ انگلیوں میں دو بیڑیاں پھنسا کر جلاتے اور ایک کسی کی طرف بڑھا دیتے دوسری اپنے منہ میں۔ دکان میں اگر کوئی بیڑی پینے والا موجود ہوتا تو سلگانے سے پہلے اُس سے پُوچھتے نہیں تھے۔ کبھی سگریٹ نوشی بھی ہو جاتی تھی۔ پیسے زیادہ آجاتے یا کوئی دوست پیکٹ لے آتا تو یہ شوق بھی پورا ہوتا۔ خرم کے ذہن میں یادوں کا منظر تمام جزئیات کے ساتھ اس حد تک تازہ ہوا کہ بیڑی، سگریٹ کی بُو ہی نہیں دھواں تک محسوس ہونے لگا۔ اُس کے لیے وہاں اب مزید رُکنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ باہر آ گیا۔ بھائی سعید کے کھانسنے کی بلغمی آواز اُس کے تعاقب میں چند قدم ساتھ آئی تھی۔

خرم سوچ رہا تھا کہ اُس زمانے میں یہاں نصف درجن اسٹوڈیو اور بھی تھے۔ رکھ رکھاؤ یا سجاوٹ کے اعتبار سے سعید بھائی کا اسٹوڈیو سب سے خستہ حال تھا مگر ان کی داخلی صورت حال شاید سب سے بہتر تھی۔ اپنے کاروبار کے تئیں بہت سنجیدہ نہ ہونے کے بعد بھی ہمیشہ خوش اور مطمئن نظر آتے۔ کبھی کسی کے سامنے دُکھڑا نہیں روئے اور نہ ہی زبان پر حرفِ شکایت کسی نے سُنی۔ خرم سڑک پار کر کے پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گاڑیوں کا شور شرابا اور راستے کی ہائے ہُو اس کے اندر برپا شور سے کم تھی۔ چہرے پر طاری اضمحلال کی گرد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ چلتے ہوئے لوگوں کی شکلیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اکثر صورتیں حیران و پریشان سی لگ رہی تھیں۔ ایک ساعت ٹھہر کر وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے اور اس عرصہ میں آئی ہوئی تبدیلیوں کو خاطر نشان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

☆☆☆

خرم تھکا ماندہ سا گھر میں داخل ہوا۔ چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے لمبی مسافت سے لوٹا ہو۔ اُس کے لیے شاید کہیں راحت نہیں ہے گھر کے ماحول سے اُوب کر باہر بھاگتا ہے۔ اور باہر کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ پھر گھر واپس آنا ہی پڑتا ہے۔

اتنے برسوں کا دل و دماغ میں بسایا ہوا اپنی ذات میں ایک شہر جو جینے کی ترغیب دیتا تھا۔ کبھی کبھی شہر آشوب بن جاتا ہے۔ ایک بار پھر سے وہ بہت مایوس تھا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اُسے اندازہ تھا کہ دیکھتے ہی اماں کے سوالوں کی جھڑی لگ جائے گی۔ اس وقت ذہنی انتشار کے سبب وہ کسی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ کسی کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ سیدھے کمرے میں گھس جائے اور اپنے طور پر، ظہار افسوس کرے۔ اُس پر نظر پڑتے ہی حسب توقع اماں گویا ہوئیں۔ ”غضب خدا کا، اب آرہے ہو۔ ایک بار نکل جاتے ہو تو پھر کچھ ہوش نہیں رہتا۔ حالات کا بھی کچھ علم ہے کہ نہیں۔ ابھی سعیدہ آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں آج پھر ہنگامی جلوس نکل رہے ہیں۔ کب کیا ہو جائے۔ کسی کو کچھ پتہ ہے۔ پولیس ویسے ہی لڑکوں کو گھروں سے اٹھا رہی ہے۔“ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ کر انھوں نے دم لیا۔

”اماں مجھے کچھ ہو بھی جائے گا تو کون ہے میرے لیے رونے والا۔۔۔؟“ بہت ہمت جٹائی تھی خرم نے یہ کہنے کے لیے۔ اماں بالکل دم بخود سی رہ گئیں۔ ایسے جواب کی امید انہیں کم سے کم خرم سے تو نہیں تھی۔ اس جواب نے انہیں اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ ماں کی ممتا جوش میں آ گئی وہ تھوڑی سخت جان تھیں مگر تھیں تو آخر اس کی ماں ہی۔ پان دان بند کر کے کنارے سرکایا اور چوکی سے نیچے اُتریں۔ خرم کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ سیدھے جا کر پلنگ پر گر گیا۔ پیٹ کے بل، تکیہ گھسیٹ کر اس میں منہ چھپانے کی کوشش کی۔ اماں بھی اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، خورشید کیا ہوا بیٹا۔۔۔؟“ اُس نے کروٹ لی۔ والدہ کو دیکھا۔ رونے کے امکانات اسے پہلے سے ہی لگ رہے تھے۔ ماں کی ایک محبت

بھری نظر نے اُس کا صبر وضبط ختم کر دیا۔ وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر چھوٹے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کسی ماں کے لیے اولاد کی عمر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اماں اُس کی جبیں اور سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ نمکین پانی ان کی آنکھوں میں بھی اُتر آیا تھا۔ اماں کی تسلی وتشفی نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ جانے کتنے دنوں کے آنسو تھے۔ ماں سے بہتر اولاد کے مزاج اور اُس کی نفسیات کو کون جانتا ہے۔ انھوں نے خاموش ہو جانے کو نہیں کہا۔ وہ جانتی تھیں کہ ابھی چند منٹ میں یہ ابر کے ٹکڑے برس کر غائب ہو جائیں گے اُس کے بعد دھوپ کھل جائے گی۔ منظر زیادہ واضح ہو جائیں گے کچھ دیر بعد ایسا ہوا بھی۔ عارضی ہی سہی مگر ماں کی آغوش سے بہتر آرام اور کہاں ممکن تھا۔ اماں کافی دیر تک اُس کے پاس بیٹھی اس کی ہمت افزائی کرتی رہیں۔ اس کے مسائل دریافت کیے مگر اُس نے گول مول جواب دیے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ وہ اپنے مزاج کے برخلاف نہیں جا سکتا۔ لوگوں کا اس کے ساتھ گھر میں کیا سلوک ہے، وہ اماں کو تمام تفصیلات بتا بھی دے تو معاملہ اماں کے اختیار سے باہر ہے۔ اب رشتوں میں حد بندی کا زمانہ ہے۔ خونی رشتے بھی اس لکیر کو عبور نہیں کر سکتے۔ ہماری حدیں متعین کر دی گئی ہیں۔ اسی حصار میں رہ کر ہمیں اپنے رشتے اور شہر آباد کرنے ہیں۔

اماں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور خرم سے باہر آنے کو کہا۔ ''منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ میں خرد سے چائے بنواتی ہوں۔۔۔۔۔۔ یا پہلے کھانا کھاؤ گے۔۔۔؟

''آ رہا ہوں۔۔۔ ابھی۔۔۔ کھانا نہیں کھاؤں گا۔۔۔'' اماں باہر نکل گئیں اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھائی کا کنبہ اتوار کا جشن منا کر واپس آ گیا تھا۔ سب کی آوازیں کمرے میں آ رہی تھیں۔ بچے دادی کو جھولوں کی مستی اور کھانوں کی فہرست ذائقوں کے ساتھ بتا رہے تھے۔ بیچ میں خرد کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آیا۔ واش بیسن پر منہ ہاتھ دھوئے۔ فریج سے بوتل نکال کر پانی پیا۔ خرد نے چائے کی پیالی اُسے پکڑا دی تھی۔ وہ اماں کی چوکی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اماں بھی وضو کر کے آ گئیں تھیں۔ چائے پیتے ہوئے اچانک اُسے ماموں وغیرہ کا خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ ابھی فون کر کے خیریت
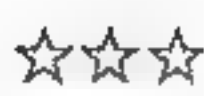
دریافت کرلے گا اور کل اُن کے گھر جائے گا۔ ☆☆☆

اگلی صبح طے شدہ پروگرام کے تحت وہ ماموں کے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ راستے بھر وہ ان لوگوں کے جتنے خراب حالات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ حقیقت اس سے کہیں زیادہ مایوس کن تھی۔ گھر کا جو سامان پہلے ترتیب سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا، آج پورے گھر میں بکھرا ہوا تھا۔ ایسے میں جھاڑو کون لگاتا۔ گردوغبار نظر آرہا تھا۔ ویرانی گھر میں زیادہ تھی یا ان دونوں کے چہروں پر، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ خرم کے لیے ایک مرحلہ اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ماموکی ہمت افزائی کس طرح کی جائے؟ دوسروں کو ہنسانے والا آج بغیر کسی قصور کے رو رہا ہے۔ چند دنوں میں برسوں کے بیمار دکھنے لگے دونوں۔ وہ پاس جا کر بیٹھا تو وہ پھر سے رونے لگے بلکہ کوشش کرنے لگے۔ کھانا پینا وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے گویائی بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ گال تک پچک سے گئے تھے۔ آنسو بھی کہاں تک نکلتے۔ بس لگ رہا تھا کہ رو رہے ہیں۔ اُن سے آنکھ ملانے کی تاب اُس کے اندر نہیں تھی۔

”آپ لوگ حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اتنی سی بات کہنے سے وہ قاصر تھا۔ کچھ بات تو کرنی ہی تھی۔ کب تک خاموش بیٹھا رہے گا۔ ”ریحان ۔۔۔۔ کہاں ۔۔۔ ہے اور وہ کیسا ہے۔“؟ خرم کو ہسرا ال گیا۔ وہ ریحان کے بارے میں کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر خرم کو لگا جیسے ماموں نے اُس کی باتیں سُنی ہی نہیں ہیں یا سُنی تو ہیں مگر سمجھی نہیں ہیں۔ وہ کچھ اور سوچ رہے تھے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ قطعی اطمینان بخش نہیں تھا۔ کون جانے اُن کے اندر کیا چل رہا ہے۔ بھوکا پیاسا کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ کب کوئی عارضہ اُبھر آئے یا ہوش و حواس پر کسی طرح کا منفی اثر نہ اُبھر آئے۔ ماموں کے ہونٹوں میں لرزش سی ہوئی۔ انھوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر خرم کی طرف بڑھایا۔ ”یہ الطاف نے لا کر دیا ہے“ الطاف ماموں کا سالا تھا۔ اُس نے پہلے ماموں کو ایک گلاس پانی دیا تھا کہ آواز کچھ بہتر ہو سکے۔ اُس نے کاغذ کھولا وہ ایک سرکاری رقعہ تھا۔

شاید چوکی یا تھانے سے آیا ہو۔ اُس نوٹس نُما کاغذ سے یہ معلوم ہوا کہ فرقان کو اے ٹی
ایس (ATS) نے اُٹھایا ہے اور اُسے جیل پہنچا دیا گیا ہے۔ اُس پر آتنگ وادیوں سے
تعلق رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اُس کی نقل و حرکت کے تعلق سے بھی کچھ اشارے کیے
گئے تھے اور دعویٰ کیا تھا کہ اُن کے پاس خاطر خواہ ثبوت بھی موجود ہیں۔ آخری لائن پر وہ
چونکا تھا مگر پھر اُس نے غور کیا کہ سرکاری زبان اسی طرح لکھی جاتی ہے لیکن اگر یہ سچ ہے
تو۔۔۔۔؟ خود سے کیے سوال کی نفی اُس نے خود کر دی۔ آدمی کی پہچان بہت مشکل
ہو گئی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو ہر گز نہیں کہ ہم اپنے بچوں کے سیاہ سفید کا فرق بھی نہیں
جانتے۔ پوری کائنات مل کر بھی یہ دعویٰ کرے کہ فرقان ملک دشمن عناصر کے رابطے میں
ہے تو بھی وہ یقین نہیں کرے گا۔ جذباتی ہو کر سوچنا اور بات ہے، جذبوں پر قابو کر
حقیقت سے آنکھ ملانا اور بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فرقان زنداں کی فصیلوں کے اُس
پار ہے۔ اُس کی ضمانت کیسے ہو پائے گی۔۔۔۔۔ ہو بھی پائے گی یا۔۔۔۔؟ اس کے
آگے کچھ اور سوچنے سے وہ قاصر تھا۔ تدبیر تو کرنی ہی ہوگی اور شاید اُسے ہی کرنی پڑے
گی۔ ماموں کے پاس تو کورٹ جانے کے پیسے نہیں ہیں۔ مقدمہ کیسے لڑیں گے بہر حال کوئی
راستہ تو نکلنا ہی ہوگا۔

سب سے پہلے ایک بہتر وکیل کا انتظام کیا جائے۔ کتنی اور کون کون سی دفعات لگی
ہیں، اس کی تفصیلی معلومات بھی کرنی ہوگی۔ وہ بیٹھا تو ماموں کے سامنے تھا مگر ذہن کہاں
کہاں اور کیا کیا سوچ رہا تھا۔ اُسے لگا کہ ماموں کو فرقان کے بارے میں وہ سب نہیں معلوم
ہے جو ایک کاغذ کے ذریعہ ابھی اُسے معلوم ہوا ہے۔ اُن کے چہرے پر کوئی ایسا ردِّ عمل
دیکھنے کو نہیں ملا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا اور تبھی ماموں کی نحیف سی آواز نکلی۔

''کیا اس میں فرقان کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔۔'' بڑی سُرعت سے اُس نے جواب دیا۔ بڑی ہوشیاری یہ کوشش
کی کہ چہرے پر آتے جاتے رنگ کچھ چغلی نہ کر بیٹھیں۔

''الطاف نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ بس پرچہ تھما کر چلا گیا یہ کہہ کر کہ خرم کو دے دیں۔ آخر ہے کیا اس میں ۔۔۔؟ ماموں پھر سے گویا ہوئے۔۔۔ ''ماموں یہ عثمان پرچون والے کا حساب ہے۔ میں کچھ سودا لایا تھا اور پیسے اُدھار کر لیے تھے۔۔'' خرم کے اس جواب سے اُن کے شک و شبہات دور ہو گئے۔

''اچھا میں ابھی کچھ کھانا وانا لے کر آتا ہوں۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے پھر اُس کے بعد بات کرتے ہیں۔۔۔'' کہہ کر وہ اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں نیم مردہ سے پڑے رہے کبھی غنودگی سی طاری ہو جاتی اور کبھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے جیسے گہری نیند میں کسی ڈراونے خواب سے آنکھ کھل گئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد خرم کھانا لے کر لوٹا۔ اُس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سب سے زیادہ بھوکا ہے۔ بہلا پھسلا کر اُس نے ان کے پیٹ میں اتنا کھانا پہنچا دیا کہ صبح تک کم سے اشتہا نہیں ستائے گی۔ بہت زیادہ بُھوک کے بعد پیٹ بھرنے کی سرشاری نشے سے کم نہیں ہوتی۔ وہ دونوں تو بنا کھائے اُونگھ رہے تھے۔ حلق میں چند لقمے اُترنے کے بعد ہلکی سی راحت نظر آئی۔ وہ وہیں پاس بیٹھا اُن دونوں کو دیکھتا رہا۔ فون نکال کر چند لمحے اُس کے ساتھ گزارے پھر موبائل رکھ کر ماموں کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ ان کی آنکھ لگ گئی تھی معاً اُسے ایک واقعہ یاد آیا۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے۔ وہ گھر پر کھانا کھا کر اُٹھا ہی تھا کہ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر آواز آئی۔ ایک اعلان سماعت فرمائیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔ نام سننے کے انتظار میں اُس نے اپنا سارا دھیان اُدھر ہی لگا دیا۔ نام کا اعلان ہوا تو اُس نے ذہن پر زور دیا کہ کیا وہ اس شخص کو جانتا ہے۔؟ یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ اماں نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ اماں اور اس نے تقریباً ایک ساتھ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا پھر بتانا شروع کیا کہ بہت دنوں سے بے چارہ بیمار چل رہا تھا۔ بڑی اذیت میں تھا۔ اللہ نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ڈاکٹروں نے تو بہت پہلے ہی جواب دے دیا تھا'' تو یہ وہ شخص تھا۔ اماں کی اتنی وضاحت کے بعد وہ

مرنے والے کو پہچان گیا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ ایک بار انہیں دیکھنے اسپتال بھی گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ایسے آدمی کی موت کی خبر جو اُس کا رشتہ دار نہ ہو یا کسی طرح کا اُس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ ہو تب بھی موت کی ہیبت کم نہیں ہو پاتی۔ موت کے متعلق تو جتنا سوچا جائے، اتنی پُراسرار ہوتی جاتی ہے۔ یہ کاروانِ اجل گرد و غبار اُڑاتا ہوا اُسے اس کی موت کے صحرا تک گھسیٹ لے جاتا ہے۔

ظہر بعد مٹی کے اُٹھنے کا اعلان ہوا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے اس سے تدفین کا وقت دریافت کیا۔ اُس نے بتا دیا بلکہ اس مسجد میں ظہر کی جماعت کا وقت بھی بتا دیا۔ ماموں اُس کے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ تکلّف کے ساتھ گویا ہوئے۔ ''اماں یہ تدفین کس چڑیا کا نام ہے؟'' کہتے وقت یہ لحاظ ضرور رکھا کہ کوئی اور نہ سنے۔

''آپ نے اس سے پہلے کبھی تدفین نہیں سُنا۔۔۔؟'' خرم نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اُن سے استفسار کیا۔

''سُنا ہوگا مگر یاد نہیں ہے۔ آج سُن کر لگا کہ پہلی بار سنا ہے ورنہ پُوچھتا کاہے کو۔۔۔؟''

''ہوں۔۔۔'' ایک گہری سانس لی خرم نے۔

''تو کیا تجھے بھی نہیں معلوم ہے۔۔۔؟'' ماموں سراپا سوال بن گئے۔

''ماموں ایک لفظ تکفین بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی آپ کی سماعت پر اس سے پہلے بار نہیں گزرا ہوگا۔۔۔'' ماموں کا کوئی ردِّ عمل آنے سے پہلے خرم نے وضاحت کی کہ میرا مطلب ہے کہ نہیں سُنا ہوگا۔

''آئیں۔۔۔'' ماموں جس قدر حیرت کا اظہار کر سکتے تھے انھوں نے کیا بھی۔ لفظوں سے زیادہ چہرے کے تاثرات سے۔

''کُل کتنے ہیں۔۔۔؟'' ماموں خاصے فکر مند سے دکھے۔

''کیا۔۔۔ کُل کتنے۔۔۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔؟''

''تدفین جیسے لفظ۔۔۔ فی الحال اُن کی تعداد اور تدفین کے مانے (معنی) بتاؤ؟''

''دفن کرنے کو تدفین کہتے ہیں۔۔۔۔ ماموں۔۔۔'' کہہ کر وہ خود بھی مسکرایا تھا۔ گوکہ یہ موقع نہیں تھا۔غنیمت تھا کہ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔خرم سوچ رہا تھا کہ یہ موضوع ماموں کی دلچسپی کا قطعی نہیں ہے۔وہ تو بس بات سے بات نکلنے لگی۔صوتی اعتبار سے ابھی ذہن میں بھی کیا کچھ رہ گیا ہے۔وہ ماموں سے کیا بتائے اور اس جگہ تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔وہ خاموش رہ کر بات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔تبھی ماموں اُس کے کان کے پاس اپنا منہ لے کر آئے۔

''مدفون بھی تو ہوسکتا تھا یا ممکن ہے کہ ہو بھی۔۔۔؟'' اس بار خرم کے اُچھلنے کی باری تھی۔اگر وہ سوگواروں کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا تو شاید بہت زور کا قہقہہ لگاتا۔اُس نے رومال نکال چہرے پر پھیل گئی مسکراہٹ پر پردہ ڈالا اور زیرلب دہرایا۔تدفون۔۔۔ واہ ماموں کیا لفظ گڑھا ہے۔یہ جسارت کسی ہماشما کے بس کی تھی بھی نہیں۔۔۔'' یہ جملہ اس نے بہت ہی آہستگی سے ادا کیا تھا۔ماموں نے سُن بھی لیا تھا اور اس بار جسارت اُن کی زبان سے چپک گیا دو تین بار وہ بدبدائے بھی۔یہ لفظ بھی ان کے لیے نیا تھا۔ظاہر ہے کہ وہ معنی سے واقف نہیں تھے مگر جانے کیا سوچ کر بات ٹال گئے۔شاید وہ اس بحث کو ختم کرنا چاہتے تھے کہ خرم نے اُن پر ایک اور انکشاف کیا۔''ماموں۔۔۔ تدفون تو نہیں ہے مگر ہاں۔مدفون ضرور ہے۔اور یہ بھی آپ نے آج پہلی بار ہی سنا ہوگا۔۔۔''

''مدفون''۔۔۔ کے تمام لفظوں کے مخارج ایک اک کر کے ادا کیے۔ماموں کو لگا کہ انھوں نے کوئی معرکہ فتح کر ڈالا ہو۔تھوڑی بہت جو حیرت بچی رہ گئی تھی اب پھیل گئی۔ ماموں کے چہرے پر ایک رنگ جا رہا تھا تو ایک آ رہا تھا۔کچھ ہونق سے نظر آ رہے تھے۔

''ما۔۔۔میاں۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔ اردو کے اس بواں کو۔۔۔ میری تو توبہ بھلی۔''

''ماموبوال نہیں۔۔۔۔۔وبال ہوتا ہے۔۔۔'' اتنا سنناتھا کہ وہ خاموشی سے اپنی کرسی سے اُٹھے اور کسی ناراض عاشق کی طرح جو محبوبہ سے روٹھ کر جاتا ہے، اُس کے سامنے سے غائب ہو گئے۔

وقت کس طرح چیزوں کے معنی تبدیل کر دیتا ہے۔آج بھی وہی شخص جس کو وہ ماموکہتا ہے اُس کی نظروں کے سامنے ہے مگر کتنا فرق آ گیا ہے۔ماموں نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔خرم نے انہیں آواز دی۔وہ اسی ساعت کے انتظار میں تھا کہ کچھ حرکت ہو اور وہ چلنے کی اجازت مانگے۔اس نے ماموکو بتایا کہ وہ ابھی گھر جا رہا ہے۔جلد ہی کسی وکیل کا بندوبست کرتا ہے۔اللہ پر بھروسہ رکھیں۔۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔وہ ان کے گھر سے باہر نکل آیا۔

خرم باہر نکلا تو سڑک پر آتے ہی تھوڑے فاصلے پر ایک ضعیف نے ہاتھ دے کر اس کی بائیک رکوائی۔عمر دراز آدمی کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر بریک لگ گیا۔حالاں کہ عام طور سے وہ کسی کو لفٹ دینے سے گریز ہی کرتا تھا ہر چند کہ ایسا کرنا اُسے خود بھی اچھا نہیں لگتا تھا مگر اب بے اعتباری کی ایسی فضا قائم ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔بہت سے واقعات وہ سن اور دیکھ چکا ہے۔کسی ضرورت مند کی مدد نہ کر پانے کا ملال بھی ہوتا مگر وہ مجبور تھا۔کسی بزرگ کے معاملے میں وہ خود کو نہیں روک پاتا۔یہ آدمی بھی جس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ٹھہرنے کو کہا۔خرم نے پاس آکر دیکھا تو اس کا خیال تھا کہ اس آدمی کی عمر اسی سے کم نہیں ہوگی۔''بیٹا اگلے چوراہے پر چھوڑ دو گے کیا۔؟'' ملتجیانہ انداز میں وہ بولے۔

''ہاں۔۔۔انکل۔۔۔ضرور بیٹھیے۔۔۔'' اُس نے گرم جوشی سے کہا۔اس اجنبی کی عمر زیادہ تھی مگر وہ فٹ نظر آرہے تھے۔بغیر کسی وقت کے بائیک پر سوار ہو گئے۔خرم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔انھوں نے بولنا شروع کیا کہ وہ کسی سرکاری محکمہ میں افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ان کے تین بچے ہیں۔دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ایک لڑکا

انجینئر ہے اور امریکہ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرا ڈاکٹر ہے اور وہ یو کے UK میں ہے۔ بیٹی اور داماد بھی جرمن میں ہیں۔ خرم سمجھ نہیں پایا تھا یہ سب کچھ ان کے لیے افتخار کا باعث ہے یا اظہار افسوس۔ ایک اجنبی سے پہلی ملاقات میں جس سے چند لمحوں بعد بچھڑ بھی جانا ہے، اتنی ذاتی گفتگو کا جواز تو اس نے نکال لیا تھا۔ ایک بڑے اور کشادہ مکان میں جہاں بات کرنے کے لیے صرف ملازم دستیاب تھے، وہ بھی تھوڑے وقت کے لیے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ ایسے میں آدمی راستے میں لوگوں کو روک کر ہی بات کرے گا۔ اچانک ان کا موضوع تبدیل ہو گیا۔ ملک کے تازہ حالات اور سیاست پر اظہار خیال فرمانے لگے۔ وہ ورزیادہ توجہ سے سننے لگا۔ ایک اقلیتی طبقے کے بارے میں ان کی رائے مثبت نہیں تھی۔ خرم کو وہی بتا رہے تھے۔ بولنے کی رفتار اور روانی سے یہ لگ رہا تھا جیسے روبوٹ میں پروگرامنگ کر کے بٹن آن کر دیا گیا ہو۔ انداز نے کے مطابق سامنے والے سے اتنا ہی وقت لیتے ہیں جتنی دیر کی ان کے پاس باتیں تھیں۔ خرم سے کنارے رکنے کو کہا۔ اس نے بائیک سائیڈ لگالی۔ وہ اُتر گئے۔ تھینک یو (Thank You) کہا۔ وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ بزرگ پھر گویا ہوئے ''May I Know Your Good Name Please'' خرم نے ہیلمٹ اُتار کر انہیں دیکھا اور چاہا کہ وہ بھی اسے دیکھ لیں۔ وہ مسکرایا بھی تھا۔ ''انکل آپ نے نام پوچھنے میں تھوڑی دیر کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم پھر ملیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اگلی بار آپ کو نام بتا دوں گا۔'' ''Have a nice day'' کہہ کر اس نے ہیلمٹ پھر سے سر پر رکھا اور بائیک سن سے آگے نکل گئی۔ وہ جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے رہے اور اس انجان آدمی کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ بائیک ان کی آنکھوں کے منظر سے غائب ہو گئی۔

●●●

خرم گھر میں داخل ہوا تو اُس کے دونوں ہاتھوں میں کیری بیکس (Carry Bags) تھے۔ اماں، ابا کے لیے پھل اوران کی دوائیاں تھیں۔ گھر کے لیے سبزی اور بچوں کے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان۔ دونوں تھیلیاں اُس نے اماں کے پاس چوکی پر رکھ دیں اور بتا بھی دیا کہ پھل آپ دونوں کے لیے ہیں۔ ''ہاں جیسے مجھے معلوم نہیں۔۔'' اماں نے جواب دیا تھا۔ خرم آئے دن ایسا کیا کرتا تھا اس لیے اماں جانتی تھیں ۔ وہ غسل خانے سے منہ دھو کر نکلا پھر کمرے میں چلا گیا۔ موبائل نکالا بہت دیر سے میسیج آنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ویسے بھی ذرا دیر موبائل سے دور رہیے، ڈھیروں چیزیں آجاتی ہیں۔ لاک کھولتے ہی واٹس ایپ پر فوٹو، ویڈیو نمودار ہو گئے۔ انترا آن لائن تھی اور اُس نے پوچھا تھا ''کہاں۔۔۔۔۔ ہو۔۔؟'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''گھر پر۔۔۔'' اس کے بعد چیٹنگ شروع ہوگئی۔

''گھر آسکتے۔۔۔۔۔ہو۔۔۔؟

''تمھارے۔۔۔؟''

''اور کس کے یہاں بلاؤں گی۔۔۔''

''کب۔۔۔؟''

''ابھی۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔''

کوئی خاص۔۔۔۔۔ بات۔۔؟''

''سب کچھ فون پر ہی پوچھو گے۔۔۔؟''

''او کے۔۔۔، دس منٹ کا وقت لگے گا۔۔''

''دیا۔۔۔''

''Thanks a lot'' کہہ کر خرم تھوڑا ٹھٹھکا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، کچھ

تو خاص ہے۔ وہیں جا کر معلوم ہو پائے گا۔

عاشق یا محبوب سے ملنے کے لیے کچھ خاص تیاریاں دونوں کو مطلوب ہوتی ہیں مگر یہاں تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ بڑے بُوڑھوں والے رویّے اور طور طریقے تھے دونوں کے۔ جیسے جوانی ساتھ رہ کر گزار آئے ہوں اور اب کوئی حسرت یا ہیجان باقی نہیں بچا ہے۔ خوشبو، عطر تو دور یہ تو کپڑے تبدیل کرنے کا بھی نہیں سوچتے۔ ایسے رشتوں میں جذبات پر اتنا قابو کبھی زیاں کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ خرّم کے ایک دوست نے کبھی اُس سے یہ شکایت درج کرائی تھی تو خرم نے جواب میں کہا تھا کہ جب کسی پر اعتبار اپنے سے زیادہ ہو جائے تو یہ خارجی زیبائش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے خیال اور نظریہ Fascinate کرتا ہے۔ نوک، پلک کا درست کرنا یا کپڑوں کی تراش خراش ایک لحہ کو بھی اپنی طرح توجہ نہیں کھینچتی۔ جس حلیہ میں ہوئے، چل پڑے۔ اس معاملہ میں انترا تو خرم سے بھی آگے تھی۔ اس کی غیر معمولی سادگی نے ہی اُسے ملتفت کیا تھا۔ آج کل تو لوگ سونے کے بیے ویسے کپڑے نہیں پہنتے جس طرح کے وہ پہن کر کسی بھی بزم میں چلی جاتی اور بولنے کے بعد مہنگے اور قیمتی پوشاک والوں کو معلوم ہو جاتا کہ اصل میں منفرد کون ہے؟

گرمی میں کاٹن کے ایک ہی انداز کے سُوٹ زیب تن کرتی۔ موسم سرما میں وولین یا سنتھیٹک ملبوسات استعمال کرتی۔ کبھی کدھار جینز بھی پہن لیتی۔ سر میں ناریل کا تیل لگا رہتا۔ بال شاید اسی وجہ سے زیادہ لمبے تھے۔ پہلے ایک ہی چوٹی باندھتی تھی۔ خرم کی فرمائش پر کبھی دو چوٹیاں بھی گوندھ لیتی۔ ایک دن خرم نے فرنچ اسٹائل میں بال باندھنے کو کہا تھا۔ اس وقت ابتدا تھی تو اس نے خواہش کا احترام کر لیا تھا مگر انتباہ بھی کر دیا تھا کہ آئندہ یہ روایتی عاشقوں والے مطالبے نہ کرنے میں ہی عافیت ہوگی۔ خرم بھی اسی مزاج کا تھا مگر اس کی پالش انترا نے ہی کی تھی۔

وہ قدرتی طور پر خوبصورت تھی۔ یہ بات اس کو کہیں ثابت نہیں کرنی تھی۔ بننے

سنور نے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ جس دن ذرا سا کاجل بھر لگا لیتی تو نظریں زیادہ اُس پر نہیں ٹھہر پاتیں۔ سادگی کی قیامت خیزی کا انکشاف انترا سے ملنے کے بعد ہی ہوا تھا۔

خرم، انترا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ بڑا سا آہنی گیٹ بہت آہستگی سے کھولا جبکہ دوسروں سے یہ توقع کرتا کہ وہ زور سے بند کریں تاکہ اسے آنے جانے والے کی اطلاع مل جائے۔ اس نے اسی احتیاط سے پھاٹک بند کیا۔ وہ سامنے ہی دہلیز کی چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ گلابی چوڑی دار پائجامہ اور پولکا کی کرتی پہنے ہوئے تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا دی۔ خرم کے چل کر وہاں تک پہنچنے سے پہلے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئی۔ پیچھے سے خرم بھی آ گیا۔

''تعجب ہے۔۔'' خرم نے بات شروع کی۔

''مجھے تو لگا تھا کہ ایک سے زیادہ ہوں گے۔۔۔؟'' مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا۔۔۔؟'' شاید وہ انترا کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔

''تعجب۔۔۔'' ۔۔اُس نے اسی انداز میں جواب دیا، اب خرم ٹھٹھکا۔ اُس نے غور کیا کہ کہاں پر چوک ہوئی ہے۔

''ہاں سوی کار کرتا ہوں۔۔آج تمھارا انداز گفتگو قطعی بدلا ہوا ہے۔ میں نے نوٹس کیا تھا۔ حسب عادت سر میں تیل بھی نہیں لگا ہے۔۔۔۔'' خرم نے اپنے طور پر بات کی وضاحت کر دی۔

ایک جگہ سُندر کانڈ میں جانا تھا اس لیے آج جلدی نہا لیے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔ خرم بھی اس کے سامنے نشست پر دراز ہو گیا۔

''تو۔۔۔۔ پھر گئیں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔؟'' اس نے انترا سے دریافت کیا۔

''نہانے کے بعد احساس ہوا کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ممی نے بھی منع کیا تو پھر جانے کا ارادہ ترک کر ہی دیا''۔ خرم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''طبیعت سے۔۔۔۔ مُراد۔۔۔؟'' لفظوں کے بیچ پیدا کیے گئے وقفے میں

پوشیدہ شرارت انترا نے محسوس کر لی تھی۔

''شیطانی نہیں۔۔۔ گھر میں اکیلی لڑکی دیکھ کر یہ نہ سوچنا کہ کچھ بھی چلے گا۔۔''

''تمھارے چہرے کے بھاؤ تمھاری بات کو سپورٹ نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح مسکر، کر کون وارننگ دیتا ہے۔۔'' کہتے کہتے خرم بھی مسکرا دیا۔

ویسے چہرے سے بیمار بھی نہیں لگ رہی ہو۔۔'' خرم نے ایک جملہ اور ادا کیا۔

''ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق۔۔۔'' پہلے سے زیادہ شرارت آمیز انداز میں وہ بولی تھی۔

''اوہ۔۔ تو یہ معاملہ ہے۔ بات اب میری سمجھ میں آئی کہ مجھ سے فرمائش کر کے شعر کیوں سنے جاتے تھے تاکہ موقع آنے پر مجھ ہی پر چسپاں کیے جا سکیں۔۔'' خرم کے جواب پر وہ ہنس ہی پڑی۔

''آج کچھ تو خاص ہے۔۔۔ تمھارا یہ روپ تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کسی ٹین ایجر (Teen ager) کی طرح behave کر رہی ہو۔ تم اتنی رومانٹک بھی ہو سکتی ہو یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔۔'' خرم کے لہجے میں تھوڑی سنجیدگی تھی۔

''بھاؤ تاؤں کی ابھی ویکتی کو چھپانے سے ویکت کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ محبت ہو یا نفرت۔۔ کس سے کتنی ہے، بتائے بغیر معلوم ہو تو محنت رائیگاں نہیں۔۔ ورنہ ۔۔۔ ویسے میں آج سیریس۔۔۔ باتیں کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں۔ تم یہیں بیٹھو۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے خاموش رہ کر انترا کا انتظار ہی کرنا تھا۔ کمرہ اور وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو سینکڑوں بار دیکھ چکنے کے بعد بھی ایک بار پھر سے نہ چاہتے ہوئے دیکھنا پڑا۔ موبائل بھی وقت گزارنے کے لیے بہتر راستہ تھا مگر یہاں آنے سے قبل وہ اُسے آف کر کے آیا تھا۔ دائیں طرف کونے میں میز پر ستار رکھا ہوا تھا۔ یہ انترا کا پسندیدہ ساز تھا بلکہ اُسے بڑی دسترس تھی۔ اُس نے موسیقی میں ہی Ph.D. کیا تھا۔ خرم نے بہت بار سنا بھی ہے۔ کچھ اُس کی پسند

کے فرمائشی نغمہ وہ اکثر صحن میں بیٹھ کر ستار کے تاروں پر چھیڑتی تھی۔ اگر وہ گھر پر ہوتا تو
واضح آواز اُس کے کانوں تک آجاتی۔ انترا اور اس کے والدین کو بھی فنونِ لطیفہ سے
خاصی دلچسپی تھی۔ شروع میں ان لوگوں سے قربت کی وجہ شاید یہی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ
کچھ اور سوچ پاتا کہ انترا آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شاپنگ بیگ تھا جو اس
نے لاکر خرم کو تھما دیا۔ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ کیا ہے مگر تب تک Happy Birth
day کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ تحیر سے جیسے اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ یہ
پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے یوم پیدائش پر اُسے مبارک باد پیش کی ہو۔ یہ کام انترا ہی کر سکتی
ہے۔ اُس بات کی جیسے ابھی بھی بے یقینی تھی۔ کسی کے وش نہ کرنے کی وجہ سے اُس کے
لیے اس دن کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ ویسے آج تو ایک بار بھی ذہن میں نہیں آیا
کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ حیرت بلکہ خوش گوار حیرت سے وہ انترا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اتنی دیر
سے اُس کے ساتھ جو رازدارانہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اُس کی پول کھل گئی تھی۔ سُندر کانڈ میں
نہ جانے کی وجہ اور یہ بدلے ہوئے روپ کا سبب۔۔؟ اُس نے بیگ کے اندر جھانکا
اور سامان باہر نکالا۔ ایک والٹ اور اس کے کپڑے تھے۔

''یہ کیا سوجھی تمہیں اور اتنی سکریسی۔ ہوا تک نہیں لگنے دی۔''

''پسند نہیں آیا کیا۔۔۔؟''

''بات پسند یا ناپسند کی نہیں ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پڑی تمہیں۔۔؟''

''اس بات پر میں نے بھی غور کیا تھا۔ تم نے تو مجھے کچھ گفٹ دیے تھے لیکن میں
نے پہلی بار یہ کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کسی کو کبھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کل کو
اگر میں نہ رہوں تو کچھ تو تمھارے پاس ایسا ہو جو میری یاد تازہ رکھ سکے۔'' خرم نے اُس
کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ حالات اور وقت کا تقاضہ تھا کہ بوس و کنار
سے خود کو روک پانا دونوں کے لیے مشکل تھا۔ چند لمحے انترا اس کے آغوش میں رہی۔ خود
سپردگی کی ایسی کیفیت اور ساعت سب کو میسر نہیں آتی۔ جلد ہی خرم نے مشتعل جذبوں پر

قابو کیا اور دونوں اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ انترا کے بدن کی خوشبو خرم کو مسحور کرتی تھی۔ چند لمحہ گزر گئے۔ کسی کے پاس جیسے کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دنیا بھر کی دانشوری بگھارنے والی۔ مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی بھی موضوع پر بات کرنے والی انترا، آخر تھی تو ایک عورت ہی۔ شرم و حیا سے گلنار ہوتی ہوئی۔ خرم بھی کچھ خجل سا دکھ رہا تھا۔ اُسے لگا کہ پیش رفت اُسی کو کرنی ہے تو خود کو تیار کرنے کی کوشش کی۔

''تمھارا مجھ سے گفٹ لینے کا یہ طریقہ مجھے بہت پسند آیا۔'' خرم نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا۔؟'' وہ چونکی تھی۔

''تم سے زیادہ تو موت کا خطرہ میرے لیے ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔۔''

''کیوں۔۔۔'' ۔۔۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''تو۔۔۔ پھر مجھے بھی لانا ہوگا کچھ نہ کچھ تمھارے لیے۔۔'' وہ ایک دم اُداس ہو گئی۔ ''کچھ اور بات کرو خرم۔۔''

''ٹاپک کو چینج کر لیتے ہیں، مگر اپنی موت کے بارے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ کہنے میں گریز کرنا چاہیے۔

''کافی پیو گے۔۔؟'' بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر کلپ لگاتے ہوئے بولی۔

''اس کے بعد کچھ کھانے پینے کی خواہش تو نہیں رہ جاتی مگر جو مزاجِ یار میں آئے۔۔''

''ایسی کی تیسی تمھاری اور مزاجِ یار کی بھی۔۔۔ بس ختم۔۔۔ لوٹ آؤ اب حقیقت کی دُنیا میں۔۔ میں کافی لاتی ہوں۔ ممی، پپا کے آنے کا بھی ٹائم ہو جائے گا۔۔۔ تم یہیں بیٹھو۔۔۔۔ خبردار جو اندر آنے کی کوشش کی۔۔۔'' کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ انترا کو کیا خبر کہ اس میں ابھی اُٹھنے کی تاب ہی نہیں بچی تھی۔ وہ گزری ہوئی ساعتیں

اپنے اندر کہیں اس طرح محفوظ کر لینا چاہتا تھا جیسے سسٹم میں کوئی فائل کسی فولڈر (Folder) میں محفوظ کر لی جاتی ہے اور ضرورت پڑنے پر ایک Click سے سب کچھ سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اُس نے پیر پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ان معطر ساعتوں کے سحر سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ جب تک کافی نہیں آئی وہ آنکھیں بند کیے کیف و انبساط کی سرشاری میں ڈوبا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بھنے ہوئے کاجو اور کافی لے کر آ گئی۔ وہ بہت عمدہ کافی بناتی تھی۔ دونوں آہستہ سے کافی سپ کرتے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہی انترا نے کہا کہ "تم اب جاؤ۔۔۔ مجھے کچھ کام بھی ہیں"۔ "ممی کو تمھارے آنے کا میں نے بتا دیا تھا۔"

"او کے۔۔۔" کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ پیکٹ سنبھال کر وہ باہر کی طرف آیا۔ خاموشی سے گیٹ بند کیا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچا تو کسی سے سامنا نہیں ہوا ورنہ پیکٹ کے بارے میں باز پرس ضرور ہوتی۔ خرد تو ضرور کر یدتی۔ اماں شاید واش روم میں تھیں۔ وہ پھرتی سے اپنے کمرے میں گیا اور الماری میں چھپا کر رکھ دیا اور خود بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحوں میں اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند میں سو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد اُس کی آنکھ کھلی۔ اُسے اچانک کچھ یاد آیا۔ تیزی سے اُٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور اپنے سامان میں وہ ڈائری تلاش کرنے لگا جس میں اس کی ضرورت کے نمبر اور پتے کے علاوہ بھی کچھ اہم باتیں درج تھیں۔ خرم کو اس وقت کچھ وکیلوں اور این جی اوز کے نمبر درکار تھے۔ اُسے یاد تھا کہ اس کی ڈائری میں یہ نمبر موجود ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ فرقان کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے اُسے ہی کرنا ہے۔ ماموں کی ساری توقعات اُسی سے وابستہ ہیں۔ یوں ہی ایک بات ذہن میں آئی کہ کسی NGO سے رابطہ ہو جائے تو فوری طور پر کچھ راحت مل سکتی ہے لیکن اس سے پہلے ڈائری کا ملنا ضروری ہے۔ چیزیں اس کے پاس حفاظت سے رہتی ہیں۔ یہ ڈائری بھی کہیں ادھر اُدھر نہیں ہوئی ہے، اتنا تو اُسے

یقین تھا۔ بس ادھر کافی دنوں سے ضرورت نہیں پڑی اس لیے ہاتھ نہیں لگی۔ ایسے موقع پر خرم کو شبیر چچا بھی بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ ہوتے تو اُن سے کافی مدد مل جاتی۔ سرکاری محکموں میں اُن کے خاطر خواہ مراسم تھے اور پیسوں سے مدد کے لیے بھی وہ فوراً آگے آ جاتے تھے۔

یہاں تو ماموں کا معاملہ تھا۔ ماموں سے انہیں بھی خاصی ہمدردی تھی مگر اس بارے میں سوچنے سے بھی کیا فائدہ۔

تھوڑی مشقت کے بعد آخر کار ڈائری مل گئی۔ اُس نے جلدی سے مطلوبہ نمبر تلاش کیے اور کئی لوگوں سے بات بھی کی۔ ملاقات کا وقت مانگا۔ لوگوں نے تسلی بخش جواب دیے اور ملنے کے لیے بھی بُلایا۔ اس بات سے وہ خاصہ مطمئن ہوا۔ ایک دو لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر اُن سے بھی رائے مشورہ کر کے جانے کی ترتیب بنانی ہو گی۔

اللہ ہی دلوں میں بات ڈالتا ہے۔ کسی تنظیم سے مدد لینے کا خیال بھی اللہ نے ہی اس کے ذہن میں ڈالا اور یہ اُمید کی پہلی کرن تھی۔ اب تک تو کہیں سے کوئی مثبت سراغ اُسے نہیں مل رہا تھا۔ اس طرح کی وافر تعداد میں گرفتاریوں کے بعد بہت لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر ایسے لوگوں کی اعانت کے لیے آگے آئے تھے جن کے پاس مدد کرنے والے نہیں تھے۔ خرم چاہ رہا تھا کہ کہیں سے کچھ نقدی کا بھی انتظام ہو جائے۔ وہ انہیں سب باتوں کو لے کر فکر مند تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس معاملے میں بھی کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔

شام ڈھل گئی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ مسجدوں سے مغرب کی اذان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

●●●

آج خرم کو وکیل سے ملاقات کرنی تھی۔ طے شدہ وقت کے تحت وہ تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ وکیل کے گھر کا محل وقوع اُس نے رات ہی فون پر معلوم کر لیا تھا۔ بائیک پر بیٹھنے سے قبل اُسے خیال آیا کہ یہ گھر تو ندی کی طرف ہے۔ یہ بات اُس کے لیے ایک اور وجہ سے بھی راحت بخش تھی۔ ادھر کافی دنوں سے وہ ندی کی طرف نہیں جا سکا تھا حالاں کہ کئی بار ارادہ کیا مگر کبھی اپنی مصروفیت کی وجہ سے تو کبھی اس وبا کی وجہ سے جو گزشتہ سال سے کسی بیماری کی طرح پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی، ابھی اُس کے پاس وقت تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے بھی ندی پر جا سکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالآخر ندی کے کنارے پہنچ ہی گیا۔ اس بار وقفہ زیادہ طویل ہو گیا تھا مگر اتنا بھی دراز نہیں ہوا تھا کہ تبدیلیاں سی محسوس ہونے لگیں۔ اُسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا پچھلی بار تک تھا۔ منظر ذہن میں محفوظ ہو کر اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں جب زیادہ توجہ کی جاتی ہے تو وہ من وعن سامنے آ جاتے ہیں۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ ندی کی چوڑائی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے مگر پانی خاصہ کم ہو گیا ہے۔ اُسے یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ پچھلی بارش میں جنوب کی طرف جہاں کنڑی کا علاقہ ہے، کٹان بہت زیادہ ہوئی تھی۔ اخبارات میں بھی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ بارش گزشتہ کئی سالوں کے مقابلے اس بار زیادہ ہوئی تھی۔ ہر طرف باڑھ کے سے حالات بن گئے تھے۔ ندی اپنے پورے شباب پر تھی۔ پانی کے مسلسل بڑھنے سے آس پاس کے گاؤں والوں کی زندگیاں خاصی متاثر ہوئی تھیں بلکہ گاؤں کے گاؤں خالی کرائے جا رہے تھے۔ ایسے میں لوگوں کی جانیں بچانا سب کا اوّلین مقصد ہوتا ہے۔ کٹان ہر بارش میں ہوتی تھی لیکن اس بار تو حیران ہی کر دیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے ندی کی چوڑائی دیکھ رہا تھا۔ تین دہائیوں میں تو اُس نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا کہ پانی کم ہونے کے بعد یہ حصہ اس قدر وسیع ہو جائے۔

اُسی مقام پر جہاں کل پانی کی زیادتی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھی، آج پانی کے

نہ ہونے پر مشکلیں پیدا کر رہی تھیں۔ لوگ آسمان کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اپنے خداؤں سے بارش کے لیے دعائیں بھی کر رہے تھے۔ وقت کس طرح چیزوں کے معنی تبدیل کر دیتا ہے۔

پُل کے اوپر یا کسی محفوظ جگہ پر کھڑے ہو کر پانی کی رفتار اور خطرے کے نشان سے اوپر ہوتے ہوئے دیکھنا، بچپن میں ان باتوں کے کیا معنی تھے اُس کے لیے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کس قدر خوش ہوا کرتا تھا۔ وہ لوگ یہاں باقاعدہ سیر و تفریح کو آتے تھے اور اب ایسے مناظر پر نظریں نہیں ٹھہرتیں۔ غرقاب ہوتے ہوئے گھر۔ مکینوں کی چیخ و پکار خرم کس طرح یادوں کے ساتھ چٹان سے پانی میں جست لگاتا تھا۔ بار بار یہ سلسلہ چلتا رہتا یہاں تک اعضا شل ہو جاتے۔ اب وہ ٹیلہ اور چبوترہ بھی غائب ہو گیا تھا جس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر وہ لوگ مستیاں کرتے تھے۔ ماضی کی کرچیاں کتنی ہی احتیاط سے بٹوریں، درد کے ساتھ خراشیں آ ہی جاتی ہیں۔

یادوں کی پوٹلی سمیٹے خرم مایوس اور اُداس کھڑا دور تک پھیلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کی حیرت اب کم ہو گئی تھی مگر افسردگی میں اضافہ ہو گیا تھا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا بھی اس طرح پانی کو ترسے گا یہ تو کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اُس نے کچھ اور خیال کیا تھا مگر اب جب وہ لوٹ رہا تھا تو ایک بے چینی سی تھی۔ خوبصورت یادیں اُسے افسردہ ہونے سے نہیں روک سکیں۔ اب اُسے یہاں سے جانا ہی تھا۔ وہ چاہ کر بھی یہاں نہیں رُک سکتا تھا۔ وکیل کے پاس جانے کا وقت ہو گیا تھا بلکہ چند منٹ زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی بائیک کی طرف آگے بڑھ گیا۔

کچھ چند منٹوں کے بعد وہ وکیل کے گھر پہنچ گیا۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد وہ اصل مدعا پر آ گیا۔ تھوڑی تمہید کی بھی ضرورت تھی۔ اختصار کے ساتھ ماموں کے متعلق بیان کیا پھر فرقان کا پورا قصہ سُنایا۔ فرقان کا موضوع آنے پر انھوں نے کچھ سوال کیے جن کے جواب خرم کو معلوم تھے۔ اُس نے انہیں بتا بھی دیا۔ مختصراً وکیل صاحب نے بھی اپنی غرض

وعایت کے بارے میں اُسے مطلع کردیا۔ سب سے زیادہ اطمینان بخش بات اُس کے لیے یہ تھی کہ اس طرح کے معاملوں کے لیے پورے مقدمے کے دوران وہ کسی سے کوئی پیسہ نہیں لیتے۔ تمام اخراجات اُن کے اور ان کی قائم کردہ تنظیم کے ذمے تھے۔ پہلا اور ایک بڑا مرحلہ اُسے آسان ہوتا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے مدد کرنے کا پورا بھروسہ دلایا۔ انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ قوم کی خدمت کرنے والے کئی مخیر ان کے رابطے میں ہیں۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے کوئی دقت پیدا نہیں ہوگی۔ اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں۔۔۔

وکیل نے دوپہر کے بعد ماموں کو اپنے چیمبر میں لے کر آنے کو کہا، جس قدر ان کا شکریہ ممکن تھا، خرم نے عاجزی کے ساتھ ادا کیا اور ایک بار پھر یہ بات دہرائی کہ "آپ صرف ایک بار ماموں سے مل لیں، باقی سب کچھ آپ خود ہی سمجھ لیں گے کہ اُن کے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے"۔

بائیک اُٹھا کر اُس نے سیدھے ماموں کے گھر کا رُخ کیا۔ سگنل پر سُرخ لائٹ آج کچھ زیادہ بُری لگ رہی تھی۔ بہر حال وہ تھوڑی دیر میں ماموں کے گھر پہنچ گیا تھا۔ ماموں مصلے پر تھے۔ خرم کو قدرے حیرت ہوئی لیکن جب تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس دروازے کے تئیں یقین اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ پاس بیٹھ کر سلام پھیرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کی آنکھیں ماموں پر ہی ٹکی تھیں۔ وہ انہیں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماموں کی معصوم اور روتے ہوئے آدمی کو بھی ہنسا دینے والی باتیں، ذہن سے نہیں نکل سکتیں۔ کشت زعفران سا شخص جس کی جڑوں میں عصبیت کا تیزاب انڈیل دیا گیا۔ سرسبز شاداب فصل جل بھُن کر خاکستر ہوگئی۔

نماز ختم ہوتے ہی خرم نے وکیل کے ساتھ ہوئی تمام گفتگو انہیں بتائی۔ اس بات پر زیادہ زور دیا کہ وکیل نے جلد ہی فرقان کو رہا کرا لینے کا یقین دلایا ہے۔ اس بات سے ماموں کے چہرے پر ہلکی سی اُمید کی کرن سی چمکی تھی۔

اُس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ آپ تیار رہیے گا۔ دوپہر میں اُن کے بستے پر چلنا ہے۔"

"اللہ آسان کرے اور تم کو خوش رکھے۔۔" ماموں کی زبان سے کئی دن بعد پورا جملہ ادا ہوا تھا۔ "میں چلتا ہوں اور انشاء اللہ وقت پر آجاؤں گا۔۔" سلام اور اللہ حافظ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

زنداں کی فصیلوں کے اُس طرف خوف سے کانپتا اور تھرتھراتا ہوا فرقان جس نے قید یا اسیری کے شائد نام بھی نہیں سنے تھے۔ وہ اُن کی صعوبتوں سے کیا واقف ہوتا۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ یہ کسی غلط کام کی سزا ہے اور وہ غلط کام کون سا ہے؟ اس قدر سوچنے کے بعد بھی وہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا مگر اُسے نہیں معلوم تھا۔ اُسے تو لگ رہا تھا کہ شائد وہ برسوں سے یہاں قید ہے۔ اُسے سورج کا طلوع غروب یاد نہیں رہا۔ وہ دن اور تاریخ بھول گیا تھا۔

اُس کا ایک دُکھ اور بھی تھا۔ وہ دُکھ اگر اسیری سے زیادہ نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی کسی نے اُس کی خیر خبر نہیں لی۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پانچ دن تک تو اُس کے گھر والوں کو یہ خبر ہی نہیں لگی کہ وہ ہے کہاں۔۔۔؟ والدین کو تو ابھی تک نہیں معلوم ہے۔ مگر وہ اپنی اولاد کے لیے کس طرح تڑپ رہے ہیں۔ اُن کی بھوک پیاس تک مرگئی۔ فرقان ان باتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ کسی لڑکے کو رات میں اس طرح سوتے سے اُٹھا کر لے جانا، وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو، ماں باپ کے کرب اور تکلیف کو کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا۔ فرقان کو سچائی کا علم بھی کیسے ہوتا۔ وہ تو اس بات پر حیران بھی تھا کہ اتنے دن میں کسی نے ملنے تک کی کوشش نہیں کی۔۔۔؟ ایسے تمام سوالات فرقان کو گھیرے ہوئے تھے۔ جس دن بھی ماں باپ سے اُس کی ملاقات ہوگی تو اُسے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ اتنے دن قید اُن لوگوں پر کیا گزری؟

سات دن جیل کے صبح، شام نے اُس کے اندر اتنا خوف بھر دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی کانپنے لگتا۔ ڈر اس لیے بھی زیادہ بیٹھ گیا تھا کیوں کہ اُسے بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔ اُس کے جسم پر چوٹوں کے نشان تھے۔ بہت سے نشانات وہ ابھی دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ جیل کے اندر جن لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا وہ ایسے لوگوں سے بالکل بھی واقف نہیں تھا حالاں کہ کچھ لوگوں نے اُس سے ہمدردی جتائی تھی۔ انہیں لگا تھا کہ اسے پھنسایا

گیا ہے وہ بہت شاطر قسم کے لوگ تھے۔ انہیں میں سے کسی ایک کے کہنے سے فرقان کی ڈیوٹی بھنڈارے سے ہٹائی گئی تھی ورنہ اُسے تو معلوم ہی نہیں کہ اس قدر آٹا گندھوایا جاتا ہے کہ ہاتھ کے اُوپری حصہ میں جہاں سے انگلیاں مڑتی ہیں اُن اُبھری ہوئی ہڈیوں پر خون چھلک آتا ہے۔

فرقان سب سے الگ تھلگ رہتا۔ کچھ لوگوں کے اندر اپنے لیے نرم گوشے اُس نے محسوس کیے تھے مگر مجموعی طور پر ابھی وہ کسی پر اعتبار نہیں کر پارہا تھا۔ نظریں اُس راستے پر ٹھہر جاتیں جہاں سے ماں باپ کے آنے کے امکان تھے۔ مایوسی بڑھ رہی تھی مگر ابھی اُمید ختم نہیں ہوئی تھی۔ بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ پتلی دال میں روٹی ڈال کر کھالیتا۔ وہاں کے طور طریقے وہ دیکھ رہا تھا۔ اجتماعی بیت الخلاء روز صفائی کے باوجود کس قدر گندہ اور متعفن ہو سکتا ہے یہ ہمارے سوچنے پر منحصر ہے۔ خوف و ہراس کے سبب نیند میں بھی خلل پڑتا۔ جب جاگنے پر اُس کا اختیار ختم ہو جاتا تو لڑھک جاتا لیکن کسی بھی آہٹ یا آواز سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا"۔ کلا۔۔۔ بستی۔۔۔ لالٹین۔۔۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔" دیر رات یہ آوازیں زنداں کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹتیں۔ وہ سہم کر اپنے آپ میں سمٹ جاتا۔ یہ کون لوگ ہیں جو رات بھر تواتر کے ساتھ یہ گردان لگاتے رہتے ہیں اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اُس نے اتنے بار دہرایا تھا کہ اُسے یاد ہو گیا تھا مگر وہ اس کے معنی ہی نہیں سیاق و سباق سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہ روز رات میں یہ ارادہ کرتا کہ صبح کسی سے دریافت کرے گا مگر دن میں اماں ابا کے علاوہ اُسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

خرم ماموں کو لے کر وقت سے کچھ پہلے وکیل ریاض کے بستے پر پہنچ گیا۔ وکیل صاحب کسی بحث کے لیے کورٹ کے اندر گئے ہوئے تھے۔ جونیئر نے نام پوچھا اور کام شروع کر دیا۔ "یہ لڑکے کے باپ ہیں۔۔۔"؟ اُس نے پوچھا تھا "ہاں۔۔۔ فرقان کے والد یہی ہیں۔۔۔" خرم نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے ان کا۔۔۔؟

’’لائیے میں خود ہی لکھ دیتا ہوں۔۔۔‘‘ خرم نے وہ کاغذ لے لیے اور نام لکھ کر اُسے بتایا کہ ان کے دستخط یا انگوٹھے کے نشان جہاں لگوانے ہوں وہ آپ دیکھ لیجیے گا۔‘‘ نام پڑھ کر اس کی آنکھیں تھوڑی پھیل گئیں تھیں۔ دس منٹ بعد وکیل آ گئے۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد انھوں نے غور سے ماموکو دیکھا۔ خرم کے ساتھ اور حلیے سے وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ اُس بچے کا باپ ہی ہوسکتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے چارگی اور ویرانی ایسی کہ کسی کو بھی رحم آ جائے۔ خرم نے ماموکے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ سب یا شائد اُس سے زیادہ وکیل صاحب نے دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے ماموکو چائے پانی کروایا اور بتایا کہ کل ہم نمبر وغیرہ لے لیں گے اور جو کچھ بھی ہمیں کرنا ہے وہ کل تک ہم کر لیں گے۔ کل انشاءاللہ آپ کے بیٹے سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔۔۔‘‘ اتنا سُنتے ہی وہ پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ خرم نے انہیں تسلی دے کر خاموش کروایا اور لے کر باہر آ گیا۔

ماموکو گھر چھوڑ کر اُس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا۔ گھر واپسی سے پہلے اُسے اماں کے پان یاد آ گئے۔ بائک پان دریبا کی طرف موڑ دی۔ کتھا بھی ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے سامان خریدا اور گھر کے لیے نکل پڑا۔

گھر پہنچا تو انجم بھابھی کے مائیکے والوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ خرم نے خندہ پیشانی سے سلام کیا۔ سامان کا تھیلا اماں کو تھما کر جانے لگا تو اماں نے روک لیا بلکہ انجم نے بھی مسکرا کر اُس سے خطاب کیا۔ ایسے میں فوراً اٹھنا کچھ معیوب سا لگا۔ چند لمحہ گزار کر اُس نے معذرت کی اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اگلے روز صبح سے ہی خرم نے تیاری شروع کر دی تھی۔ تمام ضروری کاغذات اُسی کے پاس تھے۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ فرقان کے لیے باہر سے عمدہ قسم کا کھانا پیک کروا لے گا۔ جیل میں تو بس اُلٹا سیدھا ہی مل رہا ہوگا۔ بس کوئی رخنہ نہ پڑے۔ آج فرقان سے کسی طرح ملاقات ہو جائے۔ سرکاری کاموں میں بڑی خانہ پوری کرنی پڑتی

ہے۔ تھوڑا سا خدشہ یہی تھا کہ کہیں کوئی چُوک نہ ہو جائے کیوں کہ ماموا اور ان کی بیگم کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ تھوڑا اور وقت گزر جانے کے بعد خرم نے وکیل کو بھی فون کر کے صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا۔ اُدھر سے تسلی بخش جواب سُن کر راحت کی سانس لی بلکہ وکیل صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے کچھ اور خیر خواہوں سے بات کی تھی۔ وہ لوگ بھی مدد کو راضی تھے۔ یہ باتیں سن کر اُسے لگا کہ شائد فرقان کی جلد رہائی بھی ہو جائے۔ آج ملاقات کے بعد وہ کسی وقت وکیل صاحب سے مل کر مقدمے کی تفصیلات اور دفائیں معلوم کرے گا۔

اُن تینوں کو وکیل نے پہلے اپنے بستے پر بُلایا تھا۔ بہت دیر نہیں لگی وہاں کے جو بھی معمولات تھے نمٹا کر وہ زنداں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل کچہری کے عقب میں ہی تھا۔ زیادہ پیدل نہیں چلنا تھا۔ حالاں کہ ماموا اور اُن کی بیگم میں اتنی تاب بھی نہیں تھی مگر بیٹے سے ملنے کی خواہش اور خوشی نے شائد اتنا جوش بھر دیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ قید خانے کے بہت بڑے سے آہنی پھاٹک کے باہر کھڑے تھے۔ وکیل صاحب نے آگے بڑھ کر مطلوبہ کاغذ دکھائے۔ جو باتیں پوچھی گئیں۔ اُن کے جوابات دیے اور پھر اندر جانے کا راستہ صاف ہو گیا۔ ماموا کو لگ رہا تھا کہ جیسے ہی وہ لوگ چھوٹے والے دروازے سے اندر داخل ہوں گے، فرقان سامنے کھڑا ہوا نظر آئے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایسا ہوتا بھی نہیں ہے۔ ہر چیز کے طور طریقے ہوتے ہیں۔ وہ اختیار کرنے کے باوجود چڑھاوا چڑھانا پڑتا ہے۔ جس بیرک تک انہیں جانا تھا، ایک ہرکارہ انہیں لے جانے کے لیے ساتھ کر دیا گیا۔ کئی مقامات پر باز پُرس ہوئی۔ انہیں روکا گیا۔ انتظار کروایا گیا۔ آخر میں وہ ساعت بھی آئی جب فرقان اُن کے سامنے لایا گیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور اپنے والدین سے لپٹ گیا۔ تیز آواز میں رونے لگا۔ ماں تو اُسے آغوش میں بھر کر چومتی ہی رہ گئی۔ وہ دونوں بھی رو رہے تھے۔ ''ابا ہمیں یہاں سے لے چلیے۔ یہ کیوں۔۔۔ لائیں۔۔۔ ہیں مجھے یہاں۔۔۔؟'' ماں باپ کی گویائی تو جیسے بچی ہی

نہیں تھی۔ وہ دونوں اُس کے بدن پر چوٹوں کے نشان دیکھ کر لرز گئے۔ میرے معصوم بچے کو کس بے دردی سے مارا ہے۔ اللہ غارت کرے وہ فرقان کو پیار کر رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ خرم کو جب یہ تھمتا ہوا نہیں لگا تو اسے مخل ہونا پڑا۔ فرقان ''خرم چاچا۔۔۔'' کہہ کر اس سے بھی بغل گیر ہو گیا۔ اُس نے کنارے بیٹھ کر کھانا کھانے کی تجویز پیش کی۔ سپاہی نے آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا۔ وکیل اُس اشارے کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ پاس جا کر انھوں نے بتایا کہ یہاں CCTV لگے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں آپ کی سیوا کر کے ہی جائیں گے۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ کہیں اشارہ کیمرے میں قید نہ ہو گیا ہو۔

ایک ہفتہ بعد فرقان کو گھر کا کھانا ملا تھا۔ اُس کے اپنے بھی سامنے تھے قدرے توقف کے بعد اس نے ریحان کی اور کئی قریبی لوگوں کی خیریت دریافت کی۔ ماموں کو اُمید تھی کہ فرقان اُن کے ساتھ ہی جائے گا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے تو وہ بھی پسر گئے۔ فرقان بھی ساتھ جانے کے لیے بضد۔ پولیس والے کو ڈانٹنا پڑا۔ وکیل نے بھی انتباہ کیا کہ اگر آپ لوگ ایسا کریں گے تو ہم دوبارہ ملوانے نہیں لائیں گے۔ اس دھمکی کا اثر ہوا۔ وہ کمزور پڑ گئے۔ اُن کا درد چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں پھر سے نمی آ گئی۔ ایک دوسرے کو پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر نظر کے سامنے سے غائب ہو گئے۔

فرقان کہاں اور کس حال میں ہے۔۔۔؟ جیسے اندیشے اور بے چینی تو کسی حد تک ختم ہو گئی مگر وہ ابھی بلند و بالا فصیلوں کی قید میں ہے۔ یہ حقیقت تھی۔ جو صرف اذیت ناک ہی نہیں اُن کی قوت برداشت سے باہر بھی تھی۔ جب تک فرقان رہا ہو کر اُن کے سامنے نہیں آئے گا وہ چین سے نہیں رہ پائیں گے۔ اُسے کب تک ضمانت مل پائے گی۔ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔۔۔؟ خرم تو ابھی اُن دھاراؤں سے بھی واقف نہیں جو فرقان پر لگائی گئی ہیں۔ پہلے کل وہ اس کی جانکاری حاصل کر لے، اُس کے بعد ہی اگلے قدم کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔۔۔؟

اگلے دن وہ اپنی مصروفیات سے فارغ ہوکر وکیل کے چیمبر میں پہنچا۔ وکیل صاحب کی عدم دستیابی کے سبب اُسے تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہ موبائل میں مصروف ہوگیا۔ نصف گھنٹے کے بعد وکیل آئے۔ خرم نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ وکیل کچھ فکرمند سے لگے۔۔۔

''سب خیریت ہے۔۔۔''؟ خرم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''خیریت۔۔نہیں ہے۔۔۔معاملہ اتنا سُلجھا ہوا نہیں ہے جتنا ہم سمجھ رہے تھے وکیل کی باتوں سے خرم کی تشویش بھی بڑھی۔ اُس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وکیل نے آگے بتایا۔ ''بہت سنگین اور مشکل دھارائیں لگائی ہیں۔ یہ سب طے شدہ ہوتا ہے۔ ہتھیار برآمدگی بھی دکھائی ہے۔ ملک دشمن عناصر سے رابطے میں ہونے کی بات بھی سامنے آئی ہے۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ دو مہینے پہلے ہی اٹھارہ کی عمر پوری کی ہے۔۔'' استعجاب کے ساتھ خرم کے چہرے پر فکر کی لکیریں گہری ہوتی جارہی تھیں۔ وکیل صاحب آگے بولتے رہے۔ ''میں آپ لوگوں کی بات مانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے اور یہ سب اُس پر الزام ہیں مگر کورٹ (Court) تو نہیں مانے گا۔ اُن کے پاس کیا Evidence ہیں۔ یہ سب کچھ سامنے آنے میں وقت لگے گا۔ اٹھارہ کا نہ ہوا ہوتا تو بھی کچھ راحت مل سکتی تھی۔ فی الحال جلدی Hearing کی کوشش کروں گا۔ وکیل خاموش ہوگئے تو خرم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت وہ اُن سے کیا کہے۔ جو آدمی بنا پیسے لیے کیس لڑنے کو راضی ہوگیا اُس پر بے اعتباری کا شک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وکیل صاحب مصروف تھے۔ اسسٹنٹ کو لیکر خرم سے معذرت کرکے چلے گئے۔ خرم وکیل صاحب کے بارے میں سوچنے لگا کہ آج بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ کسی حوالے کے بغیر ان سے ملا اور وہ مدد کو راضی ہوگئے۔ بستے میں کئی اور لڑکے کام میں مصروف تھے۔ انہیں مخاطب کرکے خرم نے کہا کہ ''وکیل صاحب بہت عمدہ آدمی ہیں۔۔۔'' ''جی۔۔۔'' اُن میں سے کسی ایک نے جواب دیا۔

آپ ریاض صاحب کو کب سے جانتے ہیں۔۔۔؟" یہ دوسرے نے پوچھا تھا بلکہ وہ خرم کی طرف دیکھ بھی رہا تھا۔

"دو دن ہوئے ہیں مجھے ملے ہوئے۔۔" خرم نے جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔" کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شائد کچھ سوچنے لگا تھا۔

"کوئی خاص۔۔۔بات۔۔۔؟" خرم کو لگا کہ جیسے کوئی بات ہے جو اُسے بتانے میں کچھ ہچک محسوس کر رہے ہوں۔ ایک گہری سانس لے کر وہ پھر سے خرم کی طرف مخاطب ہوا "ابھی دو سال پہلے وکیل صاحب کے ایک جوان بیٹے کو کچھ شرپسندوں نے چلتی ٹرین سے پھینک دیا۔۔۔بائیس برس کا تھا وہ۔ بارلیش اور پنج وقتہ نمازی تھا۔۔۔"

"کیوں۔۔۔پھینک دیا۔۔۔؟" خرم حیرت زدہ تھا۔

"فرقان۔۔۔کیوں۔۔۔جیل۔۔۔میں ہے۔۔؟" جواب دینے کے بجائے اُس نے سوال کر ڈالا۔ خرم کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔

"دوسرے دن پٹریوں کے کنارے اُس کی مسخ شدہ لاش ملی تھی۔ اُس کی موت نے وکیل صاحب کی زندگی کا ڈھب بدل دیا۔" وہ بولتا جا رہا تھا اور خرم سہما ہوا بیٹھا تھا۔ فرقان اور اُس سے متعلق تمام پیدا ہوئی دشواریاں جیسے اُس کے ذہن سے محو ہو گئیں۔ اُسے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ وہ دیر تک وہیں دم بخود سا بیٹھا رہا۔ وکیل صاحب کو ایک بار پھر سے دیکھنے کی خواہش ہوئی مگر اُسے لگا کہ اتنی دیر تک یہاں رُکنے کا اُس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ ابھی اس موضوع پر بات بھی نہیں کر سکتا۔ کس کے سینے میں کیا دفن ہے، کون جان پاتا ہے۔۔۔ہم تو اپنا ہی دکھ سب سے بڑا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔۔۔؟

اُدھر جیل کی کال کوٹھری میں فرقان گُم صُم سا بیٹھا تھا۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ کا وقت جیسے پلک جھپکتے گزر گیا۔ یہ وقت تو صرف رونے بھر کے لیے ناکافی تھا۔ اپنے بدن پر ماں باپ کا لمس وہ چھو کر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اب اُسے خیال آیا تھا کہ اماں ابا کی کیا حالت ہو گی۔ ایک ہفتہ میں برسوں کے بیمار سے نظر آ رہے تھے دونوں۔ ضبط محال ہو جاتا

تو رونے لگتا۔ کوئی خاموش کرانے والا تو تھا نہیں۔ تھک جاتا تو رونا بند کر دیتا۔

زخموں میں درد بھرا ہوا تھا۔ خرم کچھ دوائیں اور چوٹ میں لگانے کے لیے ٹیوب دے گیا تھا۔ کل سے وہی لگا رہا تھا۔ کچھ راحت بھی تھی۔ خرم نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ جلدی آئے گا۔ اُس نے سلاخوں کے اُس پار نظر ڈالی۔ رات اور زیادہ گہری ہو چلی تھی۔ لوگ سونے لگے تھے۔ ایک بار پھر کلا۔۔۔۔۔۔کی آوازیں سنائیں دینے لگیں۔ اُسے یاد آیا کہ اُس سپاہی سے جو اُسے بیرک میں چھوڑنے آیا تھا یہ معمہ کیوں نہ حل کروالیا جائے۔ پولیس والے نے بتایا تھا کہ ''جیسے چوکیدار' جاگتے رہو' کی صدائیں لگاتا ہے تو یہ جیل کا نعرہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ رات میں گشتی سپاہی یہ آوازیں لگاتے ہیں'' رات کے مہیب اندھیرے میں وقفے سے یہ آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

''کلا۔۔۔بتی۔۔۔لالٹین۔۔۔ٹھیک۔۔۔ٹھاک۔۔۔۔ہے''۔

●●●

خرم چھت پر اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ترشح کے سبب اُسے اپنی چارپائی اُٹھانی پڑی تھی۔ کچھ دیر میں ہی بوندا باندی بند ہو گئی مگر اُس نے مزید چند لمحے ٹھہر کر انتظار کیا کہ کہیں پھر سے پانی نہ گرنے لگے بار بار اُٹھنا اُسے گراں گزر رہا تھا۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی ذہنی انتشار میں تھا۔ دل کو یقین ہو گیا کہ اب بوچھار نہیں آئے گی تو پھر سے وہ پلنگ بچھا کر لیٹ گیا۔

بہت سے خیالات اُس کے ذہن میں اُمڈ رہے تھے۔ انترا کے ساتھ گزرا وقت وہ وہ یاد کرنا اور پھر سے محظوظ ہونا چاہتا تھا مگر فرقان کے تعلق سے وکیل ریاض نے جو خدشات ظاہر کیے تھے۔ وہ اُن سے بھی نبرد آزما تھا یہ اتنی معمولی باتیں نہیں تھیں۔ ابھی وہ ان باتوں کا ذکر ماموو غیرہ کے سامنے نہیں کرے گا لیکن مبادا وکیل صاحب کی بات سچ ہو گئی یا فرقان کی ضمانت حال فی الحال نہیں ہوئی تو۔۔۔۔۔ وہ ماموکو کیا اور کیسے بتائے گا؟ وکیل کے بارے میں نئے انکشافات نے اُسے حیران کر دیا اور اُن کے تئیں ہمدردی میں اضافہ بھی ہوا۔ مخلص اور شریف آدمی تو وہ اس اطلاع سے پہلے بھی تھے مگر یہ خبر سُننے کے بعد صورتِ حال اور ہی ہو گئی تھی۔ بڑا حوصلہ چاہیے اس کے لیے۔ یہ اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جو ذہن کو اُلجھا رہا تھا۔ کئی شہروں کے حالات خاصے تشویشناک تھے اوپر سے یہ ایک وبا اور آگئی جس نے جینا دُوبھر کر دیا تھا۔ بہت لوگ مر رہے تھے۔ بچے ہوئے لوگوں پر بھی گہرے اثرات مرتسم ہو رہے تھے۔ خرم بڑھتی ہوئی اموات کی شرح پر افسردہ تھا اور فکر مند بھی مگر وہ یہ نہیں طے کر پایا تھا کہ یہ موتیں وبا سے زیادہ ہوئی ہیں یا عصبیت سے ۔۔۔؟ بادلوں کے گرجنے اور بجلی کے کڑکنے کی تیز آوازوں سے وہ ڈر سا گیا۔ شائد کہیں بارش تیز ہو گئی تھی۔ اُس کے خیالوں کا تانا بانا بکھر گیا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وقت دیکھنے کے لیے اُس نے موبائل اُٹھایا تو اور بھی چیزیں دیکھنی پڑیں۔ انترا کا گڈ نائٹ میسج بھی پڑا تھا۔ جواب وغیرہ دے کر موبائل رکھ دیا اور ایک بار پھر لیٹ گیا۔ متعدد باتیں ذہن

میں اب بھی گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک بات آ گئی کہ کسی دن وہ فرقان سے اکیلے میں ملے گا اور اُسے اعتماد میں لے کر کچھ سوالات جن کے جوابات فرقان ہی کے پاس ہیں اس لیے اُسے جا کر ضرور کرنے چاہیے۔ ذہن میں سوال تو ہر طرح کے آتے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ فرقان پر شک کر رہا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ کبھی جانے انجانے کسی ایسے آدمی سے دوستی تو نہیں کر لی جو اچھا انسان نہ ہو یا کوئی واقعہ، بات جو ہم لوگوں کو نہیں معلوم ہو۔ اگر ایسا کہیں کچھ بھی ہے تو اُس کا علم اُن لوگوں کو ہونا ہی چاہیے اور اس کے لیے اکیلے ملنا ہی بہتر ہوگا۔ خرم اپنے ان خیالات سے مطمئن ہوا اور اُس نے ارادہ کیا کہ جلد ہی وہ فرقان سے رابطہ کرے گا۔

خرم جن بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا اُن میں دو بچوں کے ششماہی امتحان شروع ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اُسے وہاں تھوڑا زیادہ وقت دینا پڑ رہا تھا۔ کچھ اور بھی ضروری کام تھے۔ غرضیکہ تیسرے دن اس نے فرقان سے ملنے کی ترتیب بنائی۔ وکیل ریاض کو آگاہ کر دیا تھا اور نمبر لگوانے کی درخواست بھی کی تھی۔

کھانے پینے کے علاوہ کچھ اور ضروری سامان لے کر وہ معینہ وقت سے کچھ وقت پہلے زندان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ طور طریقوں سے وہ واقف ہو چکا تھا اس لیے اب کہ زیادہ دیر نہیں لگی۔ ملاقات ہونے پر جذباتی تو دونوں ہوئے مگر خرم ضبط رکھنے میں کامیاب رہا۔ اُس نے فرقان کی حوصلہ افزائی کی اور یہ بھی بتایا کہ وکیل صاحب کے ذریعہ بھنڈارے سے اُس کی ڈیوٹی ہٹوا دی گئی ہے۔ اس کے لیے پیسے دیے جاتے ہیں۔ کچھ کھانے کی اشیا نکال کر اُس نے فرقان کی طرف بڑھائیں۔ اس کے گھر والوں کی خیریت بتائی۔ مناسب وقت دیکھ کر وہ اصل مدعے پر آ گیا۔ سرسری طور پر بات شروع کی پھر ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ نفی کرتا رہا۔ ”میری کسی سے بھی کوئی نئی دوستی نہیں ہوئی ہے۔ میں بہت سی چیزوں کے بارے میں نہیں جانتا مگر ایک اچھے اور برے آدمی کا فرق تو معلوم ہی ہے۔ ہاں ایک جھگڑا ضرور ہوا تھا۔۔۔“ فرقان کے آخری جملے پر خرم چونکا

تھا۔۔۔کس سے۔۔۔کب۔۔۔کہاں۔۔۔؟ کیوں ایک ساتھ پورا تجسس باہر آ گیا۔

پچھلے مہینے وہ دوسرے محلے سے گزر رہا تھا۔ وہاں پیاس لگنے پر ایک معبد سے پانی پیا تھا۔ فرقان بولا۔

''معبد جانتے ہو تم۔۔۔؟'' خرم نے استفسار کیا۔

''ہاں، مدرسے میں حافظ جی نے پڑھایا ہے۔۔'' اُس نے وضاحت پیش کی۔

''پھر۔۔اُس کے بعد کیا۔۔۔ہوا۔۔۔؟'' خرم نے اگلا سوال کیا۔

''میں وہاں پہلے بھی کئی بار پانی پی چکا ہوں۔۔۔مگر اس بار۔۔۔؟'' کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا ہوا اس بار۔۔۔؟'' تشویش کے ساتھ خرم کا تجسس بھی بڑھا۔

''پانی پی کر میں نے گلاس رکھا ہی تھا کہ وہاں دو لڑکے آ ئے۔ انھوں نے میرا نام پوچھا تھا کہ بس مجھے مارنے لگے۔ وہ گالیاں بک رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔ اُن لوگوں کی آنکھوں میں ایسی نفرت تھی کہ میں بہت ڈر گیا تھا۔۔'' اس نے رُک کر سانس لی۔ خرم بھی تحیر پر قابو کیے خاموش بیٹھا رہا۔

''میں بہت رویا۔۔۔گڑگڑایا۔۔۔اُن کی خوشامدیں کیں کہ بھائی میرا قصور تو بتا دو تا کہ میں آئندہ نہ کروں۔۔۔'' اس بات پر اُن میں سے ایک نے وارننگ دی کہ اب کبھی اس گھڑے سے پانی مت پینا۔۔۔'' تب تک ایک بزرگ اندر سے نکل کر آئے اور انھوں نے بچایا۔ دونوں لڑکوں کو پھٹکارا بھی۔ فرقان کا خیال تھا کہ اگر وہ بزرگ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو جانے کیا ہوتا۔ وہ آدمی میرے لیے فرشتہ تھا۔ فرقان نے اس واقعے کی مزید تفصیلات اُسے بتائیں۔ خرم کے ذہن میں جو سوال آئے، وہ اُس نے کیے بھی۔ اُسے بری طرح پیٹا گیا تھا۔ اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ بزرگ شخص نے طبی مدد کے لیے ایک دواخانے تک پہنچایا۔ دوا اور ڈریسنگ کے پیسے بھی انھوں نے ہی ادا کیے۔ کچھ مزید وقت رُک کر اُس نے اپنے ہوش و حواس بحال

کیے۔ گھر جا کر رکشہ سے ٹکرا جانے کی ایک فرضی کہانی گڑھی۔

چوٹوں کا درد کم ہونے کے بعد بھی فرقان کو جب یہ حادثہ یاد آتا، اُسے یہی ایک بات زیادہ پریشان کرتی کہ اُسے مارا کیوں گیا تھا؟ بہت سی باتوں کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس ایک مہینے میں اُس کی معلومات میں خاصہ اضافہ ہوا تھا اور شائد مار کھانے کی وجہ اُسے معلوم ہوگئی تھی۔ خرم کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ شائد کوئی سراغ اُس کے ہاتھ لگا ہے۔ اُن لڑکوں نے فرقان کے نام کے علاوہ گھر کا پتہ بھی معلوم کیا تھا اور بھی کئی چیزیں اُس سے دریافت کی تھیں۔ یہ اہم اور ضروری باتیں لگ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ فرقان کی گرفتاری سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو مگر ہونے کے امکان بھی تو پیدا ہوگئے ہیں۔ بقیہ سامان اور تسلی دے کر وہ فرقان کے پاس سے رخصت ہوگیا۔ بائک نکالنے کے لیے وہ پارکنگ میں گھسا ہی تھا کہ اُس کے فون پر کال آئی۔ یہ نمبر اُس کے فون میں محفوظ نہیں تھا اور مغرب کی طرف کسی دور کے شہر کا نام آرہا تھا۔ اُس نے فون نہیں اُٹھایا۔ فوراً ہی دوبارہ رنگ ہوئی۔ اب نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُس نے فون رسیو کیا۔ کال کرنے والے نے اُس کا نام لے کر خیریت پوچھی۔ خرم آواز سے بھی نہیں پہچان پایا تھا۔ اُس نے اس بات کا بڑی شائستگی سے اظہار بھی کیا۔ ''آپ کون بول رہے ہیں۔۔۔؟''

''جانتے تو بہت اچھی طرح ہو۔۔۔ پہچاننے کی کوشش بھی کرو۔'' یہ اُسے عجیب طرح کا جواب لگا۔ ایسا کون ہوسکتا ہے جو اس طرح کا مذاق کرسکتا ہے۔ اچانک ایک خوف کی لہر سی اُس کے اندر دوڑ گئی۔ کہیں یہ فرقان سے جڑا کوئی معاملہ تو نہیں۔ ابھی وہ بہت کرید کر اُس سے پوچھ رہا تھا ممکن ہے کوئی آس پاس اُس پر نظر رکھے ہو۔ کچھ بعید نہیں کیمرے میں ریکارڈ بھی ہو رہا ہو۔ خوف و حراس اُس کے اندر اُتر آیا۔ ''ہیلو۔۔۔ فون نہیں کاٹنا۔۔۔ بڑی مشکل سے نمبر حاصل کیا ہے۔ دماغ پر تھوڑا زور دو وہ شناخت کرنے میں بالکل ناکام تھا۔ ''بھائی میں نہیں پہچان پایا آپ کو۔۔؟'' ہلکی سی خفگی بھی لہجے میں آگئی تھی۔ ابھی یہ ڈر بھی تھا کہ بیچ میں کوئی خاص جاننے والا ہی نہ نکلے۔۔۔ اس

لیے گفتگو میں احتیاط ضروری تھا۔ ''مسٹر دیکھیے آپ جو بھی ہوں۔ میں ابھی سڑک پر ہوں۔ تھوڑی دیر میں گھر پہنچ کر کال کرتا ہوں۔ تب تک شائد میں پہچان ہی جاؤں۔۔۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کرتا ہوں۔۔'' اُدھر سے آواز آئی جبکہ خرم کا خیال تھا کہ فون منقطع ہونے کی دھمکی پر وہ اپنا نام بتا ہی دے گا۔ یہ تو مشکلات اور بڑھادیں۔ وہ پہلے سے ہی کورٹ کچہری کے چکّر لگا رہا ہے اور ایسے میں یہ حرکت کون کرسکتا ہے۔ اُس کے اکثر جاننے والوں کو معلوم ہے تو پھر یہ کون ہے۔۔ کہاں سے آ گیا ہے''۔۔؟ خود کلامی کے سے انداز میں وہ بڑبڑایا اور بائک نکال کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اُس نے فون ملایا۔ لاشعوری طور پر وہ سوچ رہا تھا کہ اس کال کا کوئی تعلق فرقان کے معاملہ سے نہ ہو ورنہ ایک نامعلوم نمبر پر کال تو وہ ہرگز نہیں کرتا۔ اُدھر سے آواز آئی۔ ''پہنچ گئے گھر۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ مگر میں اب تک آپکو پہچان نہیں سکا۔'' وہ درشتی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''بڑی جتن سے تمھارا نمبر حاصل کیا ہے اس لیے چاہ تو رہا تھا کہ کچھ دیر اور پریشان کروں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ اس بار کچھ اُمید جگی۔

''بھائی۔۔۔ پلیز۔۔۔ میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں اور میں Identify نہیں کر پاؤں گا۔

''اوجھا۔۔ بول رہا ہوں۔۔'' اُدھر سے آواز آ گئی۔

''رام چندر لال۔۔۔۔ اوجھا۔۔۔۔ خرم نے رُک رُک کر نام پورا کیا۔

''ہاں مگر اب آر سی ایل اوجھا''۔۔۔

''ابے یار حد کر دی تم نے۔۔۔۔۔۔ اتنی دیر سے حیران کیے ہوئے ہو۔ کہاں ہو اور نمبر کیسے ملا۔۔۔؟''

''میں شہر آیا ہوا ہوں۔۔ کل کسی وقت مل سکتے ہو۔۔ یہ بتاؤ۔۔؟''

''وقت بالکل نہیں ہے مگر تم آئے ہو تو تم سے ملاقات سے زیادہ ضروری کچھ بھی نہیں۔ تمہیں کس وقت آسانی ہو گی۔؟ خرم نے اوجھا پر فیصلہ چھوڑ دیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد دوسرے دن کا وقت بھی طے ہو گیا اور فون منقطع ہو گیا۔ اوجھا نے اس کا فون نمبر کہاں سے حاصل کیا ہے، یہ بھی کل بتانے کو کہا ہے۔ خرم کی حیرانی اور ڈر تو کم ہو گیا تھا مگر اوجھا سے جڑی یادیں پٹارا کھول کر باہر نکل آئیں۔ ماضی کبھی صحرا ہوتا ہے اور کبھی سبزہ۔ تقریباً پچیس برس بعد اُس نے آج اوجھا کی آواز سُنی تھی۔ وہ تیسری جماعت سے اُس کا دوست تھا۔ ایک فون نے کیا کچھ تازہ کر دیا۔ وقت کی گرد اُڑی تو منظر سامنے تیرنے لگے۔

ملاقات کا وہ پہلا دن تھا۔ کلاس میں وہ اُس کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ اوجھا کی نوٹ بک پر اُس کی نظر پڑی تو خوشگوار حیرت اُس کے چہرے پر اُتر آئی۔ نہایت ہی عمدہ خوش خط تھا۔ خرم کو تو یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ اس لڑکے نے لکھا ہے۔ آخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔ اتنی اچھی ہینڈ رائٹنگ۔ کس کی ہے؟'' ''کس کی ہے۔۔۔ کا کیا مطلب۔۔۔؟ میں نے لکھا ہے۔ فخریہ انداز میں وہ بولا تھا۔

''اچھا۔۔۔'' خرم نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ اُسے لگا کہ جب اس کا خط اتنا اچھا ہے تو یہ لڑکا بھی برا نہیں ہو گا اور اُس نے فوراً دوستی کا پیغام دے دیا اور اُن کی دوستی کا آغاز ہو گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ دونوں کے مزاج میں خاصی یکسانیت تھی۔ جلد ہی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں آگے وہ وقت بھی آیا کہ اوجھا کا بیشتر وقت خرم کے یہاں گزرنے لگا۔ اُس زمانے میں والدین کسی اندیشے یا خوف میں نہیں ہوتے تھے۔ گھر بہت فاصلے پر نہیں تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر اعتبار کیا کرتے تھے۔

کالج تک آتے آتے اوجھا کی زبان کو گوشت کا ذائقہ بھی لگ گیا۔ گھر کے باہر نان ویج کھانے والوں کی تعداد ویسے بھی خاصی بڑھ چکی تھی۔ جو لوگ کھا رہے تھے اُن

کے پاس اس کے دلائل تھے۔ اب اوجھا کی ایسی غرض وابستہ ہوگئی تھی کہ اُسے روکنا مشکل ہوگیا۔ آئے دن مرغ و ماہی کے مطالبے ہونے لگے۔ وہ خود بھی منگوانے لگا۔ خرم نئے نئے ذائقوں اور کھانوں کا ذکر کرتا اور اوجھا اماں کی خوشامد میں لگ جاتا۔ اماں ہر بار مان ہی نہیں جاتیں۔ جھڑک بھی دیتی تھیں۔ کئی بار تو اُس کی ماتا جی سے شکایت کرنے کی دھمکی تک دی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ گھر میں سب سے اتنا منہ لگا ہوا تھا کہ نام کے علاوہ دونوں میں کوئی فرق نہیں بچا تھا۔ اماں کو ترس آجاتا۔ بُلا کر پوچھتیں۔ ''کیا کھائے گا؟'' وہ نظریں چُراتے یا شرماتے ہوئے کہتا کہ ''بریانی۔۔۔یا چکن فرائی۔۔'' اور بس گھر میں ہل چل شروع ہو جاتی۔

کتنے برسوں کا تعلق رہا ہے اُس کا اوجھا سے۔ وہ ملازمت کے لیے تگ و دو کرنے لگا تھا۔ خرم کے اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے۔ جبکہ اوجھا کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اُس کے والد سرکاری ملازمت میں تھے۔ اوجھا کی دلچسپی صحافت میں تھی۔ اُس کی پڑھائی کے لیے وہ شہر سے باہر جانا چاہتا تھا اور ایک دن چلا بھی گیا۔ خرم نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں۔ پرائیویٹ پڑھائی بھی کرتا رہا۔ اُس وقت لینڈ لائن فون بھی شاذ و نادر ہی ہوا کرتے تھے۔ خط و کتابت سب سے معتبر ذریعہ تھا۔ ان دونوں میں بھی بہت دنوں تک مراسلت چلتی رہی اور پھر کم ہوتے ہوتے سلسلہ ختم بھی ہو گیا''۔

کسی اخبار میں اوجھا کی نوکری لگ جانے کی خبر ایک دن اُسے اوجھا کے بھیا سے ملی تھی۔ اُس نے مبارکباد کا خط بھی لکھا تھا اور بے پناہ خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔ وہ اس بات پر زیادہ خوش تھا کہ تمھارے جیسی سوچ اس پیشے کو نئی معنویت دے گی کیوں کہ تم صرف نوکری کے لیے صحافت میں نہیں گئے ہو۔ کیا کیا یاد آنے لگا تھا جیسے پروجیکٹر پر کسی نے اُس کے ماضی کی فلم لگا دی ہو۔ اب زندگی اتنے جھمیلوں میں پھنسی ہے۔ متعدد بار اوجھا کی یاد آنے کے بعد بھی اُسے تلاش کر کے رابطہ کرنے کی وہ کوشش نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود ہمارا تعلق عارضی نہیں تھا۔ اتنے عرصے تک ملاقات نہ ہونے کے باوجود، وہ کیا تھا جو ہمیں

اب تک جوڑے ہوئے تھا۔ خرم بہت خوش تھا اور ملنے کے لیے مضطرب بھی۔ فون آنے کے بعد اُسے دیکھنے کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ وہ اوجھا کی خارجی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب کیسا دکھتا ہوگا۔ کرسی پر زیادہ بیٹھنے سے شائد توند نکل آئی ہو۔

ذہن میں ایسی کون سی جگہ اتنی محفوظ ہوتی ہے کہ وہاں سے بچپن کی تمام یادوں کو کوئی ضرر نہ پہنچی ہو۔ وہاں deleteاور Memory full کے اختیارات بھی ساتھ نہیں دیتے۔ ناپسندیدہ چیزیں Gallery سے ہٹا بھی دیں تو بھی کہیں گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی ہیں اور آر سی ایل اوجھا جیسی کسی اُنگلی کے ارتعاش سے وہ سب کچھ ہمارے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ انترا سے بھی واقف ہے مگر اُسے صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ ایک طرفہ ہے۔ کل وہ انترا کے بارے میں بھی ضرور پوچھے گا۔ خرم کے پاس وقت تھا کل کے لیے ذہنی طور سے تیار ہونے کا۔ اُسے اوجھا سے کیا کچھ دریافت کرنا ہے اُس کے متعلق بھی آج ہی سوچنا ہوگا۔ معاً اُسے اُنامکا کا خیال آیا۔ وہ اسکول سے ساتھ میں پڑھی تھی۔ اُس وقت کسی کو پسند کر لینا ہی محبت سمجھ لی جاتی۔ یہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ بات سمجھنے کے لیے عمر اور ہماری فہم و فراست کی کیا ذمے داری ہوتی ہے۔ اوجھا اُسے زیادہ ہی پسند کرنے لگا تھا۔ خرم سے وہ اپنے دل کی تمام باتیں کرتا تھا اور یہی حال خرم کا بھی تھا۔

خرم نے اُسے اظہار کا مشورہ دیا بلکہ اُکسانا شروع کیا۔ اوجھا منع کرتا رہا کہ میں نہیں کہہ پاؤں گا۔ اوجھا نے جب یہ کہا کہ ''اس معاملے میں ہم دونوں ایک جیسے ہیں تم انترا سے نہیں کہہ پا رہے ہو اور میں اُنامکا سے۔ دیکھا جائے گا۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔'' اس کے بعد خرم نے ارادہ کیا کہ اوجھا کے لیے وہ اُنامکا سے بات کرے گا۔ ردّ و قبول کی پروا کیے بغیر اوجھا اُس کے بارے میں کس طرح کے جذبات رکھتا ہے۔ یہ تو اُنامکا کو معلوم ہونا ہی چاہیے۔ ارادہ پختہ کر چکنے کے بعد خرم کو کئی دن لگے اپنے اندر اتنی ہمت جمع کرنے کے لیے کہ وہ اُنامکا کے سامنے اپنی بات رکھ سکے۔ وقت اور محلِ وقوع

کا تعین بھی کر لیا اور پھر ایک دن گیٹ کے باہر جب وہ رکشہ سے اُتری ہی تھی کہ وہ اُس کے پاس آ گیا۔ وہ بُری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ اُنا مکا سے نظریں بھی چُرا رہا تھا مگر جیسے تیسے یاد کیے ہوئے تمام جملے اُس کے سامنے ادا کر دیے۔ اُس کے چہرے پر خفگی نہیں تھی اور یہی بات خرم کے لیے راحت کا باعث تھی۔ ورنہ تو وہ مار کھا لینے تک کے لیے خود کو تیار کر کے آیا تھا گردن اُٹھا کر دیکھا تو اُنا مکا کے چہرے پر شدید حیرانی تھی۔ وہ تعجب سے خرم کو دیکھ رہی تھی۔ مثبت یا منفی کوئی جواب نہیں۔

''رام چندر کو۔۔۔۔۔۔۔ معلوم ہے۔۔۔'' اتنی آواز خرم نے سُنی تھی۔

''کس بارے۔۔۔۔ میں۔۔۔؟'' خرم نے اٹکتے ہوئے پوچھا

''یہی جو پریم گا تھا ابھی آپ نے مجھے سنائی ہے۔''

''نہیں۔۔۔ اوچھا کو کچھ نہیں معلوم ہے۔ یہ میں نے اپنی طرف سے کہا ہے۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے۔۔۔'' خرم نے نظریں چُراتے ہوئے کہا تھا۔ اس گفتگو کے درمیان خاموشی کی ساعتیں سخت سردی میں بس کی کسی جھری سے آتی ہوئی ہوا کی طرح چُبھ رہی تھیں۔

''اور کچھ بھی کہنا ہے۔۔۔ یا میں چلوں۔۔'' کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری اُس کے سپاٹ سے چہرے سے اب خرم کو ڈر سا لگ رہا تھا۔ کہیں شکایت نہ ہو جائے۔ ''نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔'' بڑی مشکل سے وہ کہہ پایا۔ اب اُنا مکا کی طرف دیکھنے تک کی ہمت نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی اور کالج کے اندر داخل ہو گئی۔ خرم نے دیر سے روکی ہوئی سانس باہر چھوڑی۔ دائیں بائیں نظر اُٹھا کر جائزہ لیا کہ کسی نے یہ منظر دیکھا تو نہیں مگر کوئی نہیں تھا جو نوٹس کر رہا ہو۔ اُس کے جان میں جان آئی۔ اُنا مکا کو جواب تو دینا ہی چاہیے تھا۔ خرم نے آگے بڑھتے ہوئے یہ سوچا پھر فوراً ہی یہ بات ذہن میں آ گئی کہ کہیں پرنسپل سے شکایت نہ ہو جائے اس خیال کے ساتھ ہی بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

اس واقعہ کے چار دن بعد اوجھا نے خرم کو ایک مُڑا تڑا کاغذ تھمایا۔ چہرے پر پژمردگی طاری تھی۔ کاغذ کو کھولتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ''کیا ہے یہ۔۔؟'' ''خود ہی دیکھ لو۔۔۔سب تمھارا ہی کیا دھرا ہے۔'' اوجھا نے تھوڑی ناراضگی بھی دکھائی اچانک خرم کی سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ اب تک کاغذ سیدھا ہو چکا تھا۔ تخاطب کے بعد فوراً آخری سطور دیکھیں ''آپ کی۔۔۔'' اور ایک دم سے اُس کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اوجھا نے خرم کو اپنے سینے سے لگا لیا'' تھینکس یار۔۔۔تو نے میری کتنی بڑی سمسیا حل کر دی۔ یہ کام میں نہیں کر سکتا تھا۔'' وہ اور بھی جانے کیا کیا کہتا رہا۔ خرم نے اُس سے Treat مانگی۔ اوجھا نے اسی شام ایک عمدہ ریستوراں میں خرم کو کھانا کھلایا بلکہ اَنامکا کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی گئی مگر تب اتنی آسانیاں نہیں تھیں۔

اُس دن اوجھا کی سرشاری اور مسکراتا ہوا چہرا ایک بار پھر اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کیا انجام ہوا اس کہانی کا۔؟ اُس نے سوچا کہ وہ سب سے پہلے اوجھا سے یہی دریافت کرے گا۔ وہ دیر تک اوجھا کے تعلق سے اور بھی جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

اگلے روز وہ طے کیے ہوئے وقت پر آ گیا۔ گھر سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے اس لیے اُس کی خواہش تھی کہ پہلے یہاں سب سے ملاقات کر لے اُس کے بعد وہ لوگ اپنے طور پر کہیں جا بیٹھیں گے۔ اوجھا کو دیکھ کر اُسے کچھ جھٹکا سا لگا تھا۔ کل سے اب تک اُس نے جو شبیہ تصور کی تھی، وہ اُس سے بالکل الگ تھا۔ پہلی نظر کا تاثر بعض اوقات فیصلہ کُن بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کوئی کُلیہ نہیں ہے۔ اُس کا پیٹ تو خاصہ نکل آیا تھا مگر خرم کو جس بات پر حیرانی تھی وہ اوجھا کی جبیں پر لگا تلک تھا۔ مختلف رنگ کے دھاگے جنھیں کلاوا کہتے ہیں اس کے دائیں ہاتھ میں بندھے ہوئے تھے۔ قمیض کا اُوپری بٹن کھلا ہونے کی وجہ سے اُس کے گلے میں پڑی رودراکش کی مالا بھی خرم کو نظر آئی۔ ایک جھٹکا سا لگا تھا جو فطری بھی تھا مگر جس اوجھا سے اُس کی دوستی تھی یہ وہ تو نہیں لگ رہا ہے۔ دُنیا اتنی بدل گئی ہے شائد وہ درست اندازہ نہیں کر پایا تھا اور غالباً تحیّر کی یہی وجہ تھی۔ چند لمحوں میں

ذہن سے کیا کچھ ہو کر نکل گیا، دونوں کی لاکھ بے تکلفی سہی مگر وقت کی جمی ہوئی گرد صاف ہو تو معلوم ہو کہ یہ تبدیلی خارجی ہے یا داخلی اُس سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ایک تکلف تو خرم کے لیے حائل ہو ہی گیا تھا۔ اوجھا نے بہت گرم جوشی کا اظہار کیا اور وہی پہلے والی بے تکلفی بھی۔ ایک اک کی خیریت دریافت کی خرد کو اُس نے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا تعارف ہوا۔ اماں سے بے شمار سوال۔ خرم ہواؤں کا زور کم ہونے کے انتظار میں بیٹھ کر سب تماشے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ خرم کی طرف مخاطب ہوا تو سب سے پہلے اُس کو موبائل نمبر فراہم کرنے والے کا نام پُوچھا۔ وہ ہنس کر ٹال گیا۔ ''اتنی جلدی کا ہے کی ہے ۔۔۔ بتادیں گے۔۔'' معنی خیز انداز میں وہ مسکرایا تھا۔

''تو وہ نمبر آپ نے مانگا تھا۔۔'' خرد حیرت کے ساتھ بولی تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک روز ماموں مجھ سے ایک پرچی پر لکھوا کر لے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ خرم کے کسی پرانے دوست نے طلب کیا ہے۔ میں تو بھول گئی تھی۔ خرد نے تقریباً وضاحت کردی تھی۔

''میں نے اپنے ایک متر سے کہا تھا وہ ماموں کو جانتا تھا۔ یہ تاکید کردی تھی کہ میرا نام نہ سامنے آئے۔'' کہہ کر اوجھا ہنسنے لگا۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر وہ دونوں اُوپر خرم کے کمرے میں آ گئے اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اُس نے بتایا کہ آسام میں سب سے بڑے اخبار میں مدیر ہے۔ اخبار کا نام سُن کر اوجھا کے اس رُوپ کا سُراغ خرم کو مل گیا تھا۔'' مجھے اس پیشے کے علاوہ کچھ اور کرنا نہیں تھا۔ بہت دھکّے بھی کھائے۔ چھوٹے، بڑے، بہت سے اخباروں کے ساتھ کام کیا لیکن گذشتہ تیرہ برس سے اسی سے جڑا ہوں اور اب یہیں سے پرلوک دھام کا ارادہ ہے۔ اوجھا نے بتایا کہ پچھلے ہفتے ہی اُس کے چاچا جی کا سورگواس ہو گیا ہے اُسی سلسلے میں اُسے شہر آنا تھا۔ سوچ تو بہت دنوں سے رہا ہوں مگر اس بار طے کر لیا تھا کہ مل کر ہی جانا ہے۔ اخبار کی نوکری میں چھٹی نہیں ہے۔ وہ خاموش ہوا۔

''اور پھر اتنے بڑے اخبار میں ۔۔۔ وہ بھی سمپادک ۔۔'' خرم نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''چلو اب باہر چلتے ہیں ۔۔ یہاں قید و بند کے ساتھ بیٹھنا ہو گا۔ میں نے

سب کچھ پلان کرلیا ہے۔۔چلو باہر بتاتے ہیں۔''''او۔۔کے۔۔''اوجھا نے جواب میں اتنا ہی کہا۔وہ دونوں اُٹھ کر باہر نکل آئے۔باہر آتے ہی خرم نے پہلا سوال اَنامکا کے تعلق سے پُوچھا۔

''تو تمہیں۔۔۔ابھی تک۔۔یاد ہے۔۔؟'' تھوڑے تحیّر کے ساتھ اوجھا بولا تھا۔

''کیا۔۔۔؟''خرم نے باقاعدہ حیرت کا اظہار کیا۔

''اَنامکا۔۔۔اور۔۔۔کیا۔۔۔''

''کیوں مجھے یاد نہیں رکھنا چاہیے۔۔۔''خرم کے لہجے میں تھوڑی سی شرارت بھی در آئی۔

''ہاں۔۔۔کیوں۔۔نہیں۔بالکل یاد رکھنا چاہیے۔اَنامکا بھی تمہیں بھولی نہیں ہے آخری جملے پر خرم کی حیرت زیادہ بڑھ گئی۔

''مطلب۔۔۔؟''اُس کے چہرے پر حیران ہونے کے اشارے موجود تھے۔

''سچ تو یہ ہے کہ تم سے ملنے کے لیے اَنامکا نے بہت پریس کیا ہے مجھے۔۔۔'' اوجھا تھوڑا جذباتی سا ہورہا تھا۔

''یعنی۔۔وہ اب تک تمہارے رابطے میں ہے۔۔۔؟'' لگ رہا تھا کہ خرم کی آنکھیں باہر ہی نکل آئیں گی۔

''اَنامکا میری دھرم پتنی ہے۔۔میرے دو بچوں کی ماں ہے'' کہتے کہتے اُس نے موبائل نکال کر اپنے کنبے کی تصاویر بھی دکھائیں۔''یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا تھا۔ہم لوگ اکثر اس حوالے سے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔۔۔''خرم کو تو جیسے یقین ہی نہیں ہورہا تھا۔فوٹو نہ دیکھے ہوتے تو شائد اتنی جلدی یقین نہ کرتا خوشگوار حیرت سے وہ اوجھا کو دیکھتا رہا۔اوجھا نے انترا کے بارے میں پُوچھا۔جواب میں اُس نے بتایا کہ سب کی قسمت تمہاری جیسی نہیں ہوتی۔انترا کی ممی سے ایک بار اس رشتے کے تعلق سے اُس کی بات ہوئی تھی بلکہ انھوں نے ہی یہ موضوع چھیڑا تھا ورنہ وہ تو یہ ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

انہیں ہمارے رشتے سے کوئی شکایت نہیں تھی مگر اکلوتی لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ مجبور ہیں اور پھر اب حالات اتنے نازک ہو گئے ہیں کہ اس کے لیے کوئی عملی کوشش ہم دونوں کے لیے شائد نا قابلِ تلافی خسارہ کی وجہ بن جائے۔ وہ تعلیم یافتہ اور بہت سلجھی طبیعت کے لوگ ہیں ورنہ کوئی ماں اپنی بیٹی کے عاشق سے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتی اور ایسی صورت میں کہ لڑکا دوسرے مذہب کا ہو۔ خرم نے پہلی بار کسی سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا یہ باتیں سُن کر اور اُسی دن سے اُس کی نظر میں تعظیم اور بڑھ گئی تھی۔ انترا نے بھی خرم سے کافی تفصیل سے بات کی تھی۔ کچھ فلسفہ بھی بگھارا تھا کہ نہ ملنے سے ہماری محبت زیادہ تابناک اور معنی خیز ہو جائے گی۔ ممکن ہے کل حالات سازگار ہو جائیں۔ وہ ایک چراغ جسے عشق کہتے ہیں اگر سچ میں روشن ہے تو آخری سانس تک معدوم نہیں ہو سکتا۔ وہ دونوں اسی افتخار میں جی رہے تھے۔

اس کے بعد اُنا مکا کی بچوں کی اور کہاں کہاں کی باتیں یاد کر کے وہ کڑتے رہے۔ اوجھا نے اگلی بار جلد ہی فیملی کے ساتھ آنے کا وعدہ کیا۔ برسوں پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اوجھا کے پاس دو دن کا وقت بچا تھا۔ اگلے دن بریانی کھانے کا پروگرام بنا۔ شہر کی سب سے عمدہ اور لذیذ بریانی اور فرائی چکن جس ریستوراں میں ملتا ہے، وہاں جانے کی بات طے ہوئی۔ اوجھا کے رخصت ہوتے ہی خرم کو ماموکا خیال آیا بلکہ وہ بے چین تھا۔ وہ اُن کے گھر کی طرف چل دیا۔ اب وہ فرقان اور ماموکے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ لوگ اس قدر ٹوٹ چکے ہیں کہ فرقان کی رہائی کے علاوہ ان کی یکجائی کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور اُس کی ۔۔۔ رہائی ۔۔۔؟ اس کے آگے کچھ اور سوچنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وکیل صاحب نے جو اندیشے اُس کے سامنے ظاہر کیے تھے، وہ ماموسے بیان بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی تو الزام تراشی، بحث و مباحثے گواہوں اور ثبوتوں کی پیش کش۔ اُس کے بعد تاریخوں کا سلسلہ ۔۔۔ یہ سب کچھ وہ ماموسے نہیں کہہ سکتا۔ اُن کے پاس تو بس ایک سوال ہے" ۔۔۔ فرقان کیوں نہیں چھوٹا۔۔۔ کب چھوٹے گا۔۔۔؟"

چند ماہ ہوئے فرقان کو اٹھارہ کی عمر پار کیے ہوئے۔ ستارے جب گردش میں ہوتے ہیں تو پھر یہی سب ہوتا ہے۔ وہ ماموں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیٹے کو دیکھ لینے سے انہیں کافی راحت ملی تھی۔ ہمت افزائی کے کچھ جُملے اُس نے ادا کیے۔ خرم کا ہم زاد البتہ اُس سے سوال دریافت کر رہا تھا۔ ''شہر ذات کی یہ کون سی حدیں ہیں جہاں کوئی ذی روح اس درجہ بے چارگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ خرم نے انہیں بتایا کہ وہ کل بھی فرقان سے ملا ہے اور آگے بھی ملاقاتیں رہیں گی۔ اب کہ وہ فرقان کی ماں کو بھی لے جائے گا۔ جیل جا کے مل لینا اب مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ واپس آنے کے بعد شروع ہوگا۔ ان دونوں کے لیے ہی یہ مشکل مرحلہ ہوگا۔

کچھ قریبی اور ماموں کے سالے وغیرہ ان لوگوں کے کھانے پینے کا نظام دیکھ رہے تھے۔ محلے کے بھی دو تین لوگ اعانت کر رہے تھے۔ خرم بھی جب آتا تو خورد و نوش ساتھ لے کر آتا یا بعد میں لا کر دیتا۔ کسی جاننے والے نے زکات کے مد میں خرم کو کچھ روپے دیے تھے۔ وہ اُس نے ماموں کے سپرد کر دیے۔ وہ منع کرتے رہے مگر اُس نے زبردستی اُن کی جیب میں ڈال دیے۔ ''جب ضرورت ہوگی تو میں لے لوں گا۔۔۔'' خرم کی اس بات سے وہ ڈھیلے پڑے۔

''خرم میاں۔۔۔ تم جو کچھ مجھ غریب کے لیے کر رہے ہو، اس کا اجر تمہیں وہی دے گا۔۔۔'' ماموں نے کہہ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی چرخ کی وسعتوں میں جھانکنے لگا۔ ان دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان میں خرم کے لیے اظہار تشکر تھا۔ دُعائیں بھی تھیں۔

''یہ پیسے میں تمہیں آخرت میں ہی واپس کر پاؤں گا۔۔۔'' ماموں کی آواز پھر خرم کے کانوں میں پڑی۔

''عالم ارواح میں یہ کرنسی نہیں چلتی ہے ماموں۔۔۔'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔ مسکرانے کی شعوری کوشش اس لیے کی کہ شائد اُداسی کچھ کم ہو۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ

کرنسی کے علاوہ عالم ارواح بھی اُن کا کچھ مسئلہ بنے ہوں گے مگر اس پر اس سے زیادہ بات اس وقت ممکن نہیں تھی۔

''تو پھر وہاں کون سا پیسہ چلتا ہے۔۔۔؟'' ماموں نے فکر مند ہو کر استفسار کیا۔

''وہاں نیکیاں اور اچھے عمل پیسوں کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔آپ کو وہ واقعہ یاد ہے۔ایک بار آپ نے ہی مجھے بتایا تھا بلکہ پُوچھا تھا'' وہ ماموں اور اُن کی اہلیہ کا دھیان اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگانا چاہتا تھا۔

''کون۔۔۔سا۔۔۔؟'' متجسس ہو کر انھوں نے خرم کی طرف دیکھا۔

''ایک دن جمعہ کے بیان میں مولانا صاحب نے کہا تھا کہ سو میں سے ڈھائی روپے نکال دو گے تو یہ پیسے سو سے زیادہ ہو جائیں گے۔اس کے برخلاف بیاج کے دس روپے جوڑ دو گے تو بظاہر یہ ایک سو دس ہو جائیں گے مگر اللہ کا فرمان ہے کہ یہ ساڑھے ستانبے سے کم ہیں۔یہ حساب محیر العقول ہے۔آپ یہ لفظ پورا ادا نہیں کر پائے تھے۔میں نے جب دہرایا تھا تو آپ نے تائید کی تھی کہ ہاں یہی کہا تھا۔آپ یہ مسئلہ لے کر سیدھے میرے پاس آئے تھے کہ ایک سو دس ساڑھے ستانبے سے کم کیسے ہیں۔۔؟ خرم نے انہیں اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ دعویٰ اللہ کا ہے اور اللہ کے کسی دعویٰ پر شک وشبہ کرنا خطرے سے خالی نہیں۔جو بات سمجھ میں نہ بھی آئے مگر یقین کر لینے کا ہی نام ایمان ہے۔ہمارے اچھے اعمال کے عوض وہاں جو اجر ملے گا وہ پیسے سے بھی بہتر ہوگا۔''
اتنی ساری گفتگو کے بعد اُس کا خیال تھا کہ ماموں کی توجہ کہیں اور مبذول کروادی ہے۔چند ساعتیں خاموشی سے گزریں۔ماموں بڑی یاس وحسرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔لبوں میں جنبش ہوئی۔

''کب تک چھوٹے گا فرقان۔۔۔؟'' یہ سوال اُسے قطعی اچھا نہیں لگا تھا مگر اس نے کوئی منفی ردِّ عمل پیش نہیں کیا۔بہت جلدی خود پر قابو پالیا اور ایک بار پھر اُن کی ہمت افزائی کی کوشش کرنے لگا۔وہاں زیادہ دیر رُکنا بھی اُس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔وہ بہانا

بنا کر اور جلد واپس آنے کی بات کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

اوجھا اگلے روز سیدھے ضیافت ہوٹل پہنچا جہاں اُسے اپنی پسند کا کھانا کھانا تھا۔ شہر میں سب سے عمدہ بریانی وغیرہ کا یہ مرکز تھا۔ اوجھا نے بھی خاصی تعریف سُن رکھی تھی شائد اسی لیے اس نے خود ہی وہاں کھانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ خرم دو منٹ قبل ہی وہاں پہنچا تھا۔ ابتدائی دنوں میں اوجھا نے یہاں کی بریانی کھائی تھی تب ہی وہ ذائقہ اُس کے منہ لگا تھا۔ اوجھا کی خارجی تبدیلی کی وجہ سے خرم کو لگا تھا کہ شائد اُس نے چھوڑ دیا ہو مگر اُس کا خیال غلط تھا۔ ہر چند کہ یہ اب اوجھا کے لیے غالباً اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک لفظ یا اشارے سے مفہوم و معنویت بدل جاتی ہے۔ اوجھا نے تو پوری عبارت ہی تبدیل کر دی تھی۔ وہ اس موضوع پر اوجھا سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ابھی تک موقع محل نہیں بن پایا تھا۔ کل سے اب تک سوال در سوال۔۔۔ پھر اس کے اندر سوال۔۔۔؟

اوجھا کے آنے سے پہلے خرم سوچ رہا تھا کہ اس ویش بھوشا کے بعد بھی اوجھا نے نان ویج کھانا ترک نہیں کیا ہے تو اس کا ایک مطلب تو یہ بھی ہے کہ کسی لالچ یا غرض سے یہ رُوپ دھارن کیا ہے۔ اخبار کی ملازمت سے بھی اس کا کچھ تعلق ممکن ہے بلکہ سب سے زیادہ امکان اسی بات کے نظر آرہے ہیں۔ خرم نے یہ طے کر لیا تھا کہ اُس کے جانے سے پیشتر وہ اوجھا سے پُوچھے گا ضرور۔ اس کے بعد اوجھا کی آمد ہوئی۔ ہائے ہیلو کے بعد خرم نے مینو کارڈ اُٹھا کر اوجھا کی طرف بڑھایا۔۔۔۔ ''لو۔۔۔تم خود ۔۔۔ہی دیکھو اور آرڈر کرو۔۔۔'' اوجھا نے بے توجہی سے مینو کو کنارے رکھا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔ایک فل فرائی (Full Fry) اور اُس کے بعد بریانی کھائیں گے۔ جتنی کھا سکے۔۔'' کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ خرم نے ویٹر کو بُلا کر آرڈر نوٹ کروایا۔ اب انہیں تھوڑا انتظار کرنا تھا۔

''تم نے میرے اس نئے رُوپ کے بارے میں اب تک کوئی پرشن نہیں کیا۔''

آخر کار اوجھا یہ موضوع زیرِ بحث لے ہی آیا۔ خرم کو بھی یہ بہتر لگا کہ اُس نے خود ہی بات چھیڑی۔ ''ہم تم ایک دوسرے کو جتنا جانتے ہیں، اُس حساب سے تمہیں آشچریہ ضرور ہوا ہوگا۔''

''ظاہر ہے۔۔'' مختصر سا جواب دے کر خرم معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ اوجھا نے بھی اسی انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔

''کل سے اب تک تم نے میرے اندر بھی کچھ پری ورتن دیکھے یا۔۔۔؟'' اوجھا جملہ مکمل کیے بغیر خاموش ہو گیا۔

''اندر کوئی چینج نہیں آیا ہے۔ باہری تبدیلی کی وجہ بھی کسی حد تک میں سمجھ بھی گیا ہوں۔۔۔ شاید'' خرم نے جواب دیا۔

''تمہیں۔۔۔۔ شائد کی ضرورت کیوں پڑی۔؟'' اُس نے اگلا سوال کیا۔

''شائد ہٹا لیتے ہیں۔'' ان باتوں کا کوئی سرا دھر انہیں لگ رہا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ یہ تمہید جیسا کچھ ہے۔

''ایک بڑے اخبار کے سمپادک کے لیے جو رُوپ ہونا چاہیے تم نے وہی دھارن کیا ہے اُس اخبار کی وچار دھارا سے میں واقف ہوں۔'' خرم نے اپنی بات ختم کی۔ اب اوجھا کے مسکرانے کی باری تھی۔

''میں کسی اور پیپر میں کام کر رہا ہوتا تو میرا یہ حُلیہ نہیں ہوتا۔'' اوجھا کے جواب میں ایک سوال بھی پوشیدہ تھا۔

''ہوں۔۔'' ایک گہری سانس لے کر وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

''اندر سے ہم دونوں ایک جیسے ہونے کے باوجود ایک بنیادی اور بڑا فرق بھی ہے۔۔'' خرم نے ٹھہر کر انتظار کیا کہ شائد وہ کوئی سوال کرے۔

''بولتے رہو۔۔۔'' اوجھا نے بس اتنا ہی کہا۔

''اس ویش بھوشا کے لیے تمہیں فائدہ بھلے ہی نہ ہو مگر نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے

برخلاف اگر میں اپنے مذہب کے مطابق اپنا حلیہ بدل لوں۔۔۔تو۔۔؟''

''کون پہنچائے گا نقصان۔۔؟'' اوجھا نے خرم کا جملہ پورا کر دیا۔

''کم سے کم رام چندر لال۔۔۔۔۔اوجھا۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔نہیں۔۔۔اور پھر تم اُس کا نام میرے منہ سے کیوں سننا چاہ رہے ہو۔؟''

''ایک دلچسپ سوال پوچھوں تم سے۔'' اوجھا نے کچھ راز داری کے سے انداز میں اس سے کہا۔

''سوال کے لیے تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔''

''ادھر کچھ سالوں میں دیش کے حالات جس طرح تبدیل ہوئے ہیں، ہم دونوں اُس کے سیاسی معنی بھی جانتے ہیں۔ یہ سب ہوتا آیا ہے۔ ہوتا رہے گا۔'' اوجھا نے وقفہ لیا۔

''ہاں۔۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔۔'' خرم نے تائید کی۔

''سب سے اہم سوال جو میں صرف تم سے ہی پُوچھ سکتا ہوں۔ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے اگر میں یہ سوچتا ہوں کہ اس دیش کو ہندو راشٹریہ گھوشت ہونا چاہیے تو خورشید احمد کا کیا جواب ہوگا۔؟'' خرم کو لگا جیسے کسی نے ننگا تار اُس پر ڈال دیا ہو۔خرم کو داخلی شکست وریخت پر قابو کا خاصہ تجربہ تھا۔تبھی ویٹر اُن کا آرڈر لے کر آگیا۔کشتی میں فرائی مُرغ سجا ہوا تھا۔ پیاز اور چٹنی بھی اُس نے میز پر رکھی۔خرم نے کولڈ ڈرنک کا مطالبہ بھی کیا۔وہ اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔اوجھا کے منہ میں پانی آگیا تھا۔اب مزید رُک پانا اُس کے لیے دشوار تھا۔اپنی پلیٹ میں کچھ حصہ نکال کر وہ ٹوٹ ہی پڑا۔''تم بھی تو لو۔'' پہلی قاش منہ میں ڈالنے کے بعد وہ خرم سے بولا۔

''یار۔۔۔اوجھا۔۔۔اس ٹاپک پر میں بھی تم سے ہی بات کر سکتا ہوں کیوں کہ یہ بہت نازک وِشے ہے۔

''میں بالکل ہندو راشٹریہ کی حمایت کرتا ہوں مگر آگے کچھ اور کہنے سے پہلے

تمھاری زبان سے ہندوراشٹریہ کی پری بھاشا سُننا چاہتا ہوں کیوں کہ بھیڑ جس ہندو راشٹریہ کا مطالبہ کررہی ہے وہ سناتن دھرم کی مُول وِچار دھارا کے بالکل وِپریت ہے۔''

''میں تمھاری بات سے سہمت ہوں۔'' اوجھا کے تاثرات بھی مثبت تھے۔''یہ میری بات نہیں ہے یہ یتھارتھ ہے جو ہم نے تم نے اتنے برس ساتھ رہ کر پڑھا اور جانا ہے۔کوئی مذہب کسی سے نفرت کی ترغیب کیسے دے سکتا ہے۔میرے زخم کا درد محسوس کیے بغیر نہ تم بہتر ہندو ہو سکتے ہو اور نہ میں مسلمان۔ سناتن دھرم کی سہشنُرتا اور مریادا پُروشوتم رام کہنے کا مطلب میرے ذہن میں بھی وہی ہے جو تمھارے۔'' خرم خاموش ہوا تو اوجھا نے کولڈ ڈرنک حلق میں انڈیلی اور پھر ڈکار لی۔اُس کی آنکھیں کچھ سوچنے کے سے انداز میں سکڑنے لگیں۔''تم نہیں کھاؤ گے۔۔۔کیا؟؟؟'' اب خرم کی توجہ کھانے کی طرف گئی۔اُس نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھایا اور باقی اُس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔تم سَیر ہو کر کھاؤ۔ابھی بریانی بھی منگواتا ہوں۔''

''یار خرم۔۔۔۔اس ویش بھوشا میں پبلک ریستوراں میں بیٹھ کر اس طرح نان ویج کھانا تمھیں حیران نہیں کرتا''؟ اوجھا نے ایک اور سوال کیا۔

''نہیں۔۔۔۔اب حیرانی مشکل سے ہوتی ہے۔یہاں زیادہ تر تمھاری کاسٹ کے لوگ ہی آتے ہیں۔تم نے کھانے کی شروعات بچپن میں کردی تھی۔اس عرصہ میں پورا منظر نامہ تبدیل ہوتا گیا۔'' خرم نے اپنی بات ختم کی۔

''تم جانتے ہو کہ میں پہلے پیاز بھی نہیں کھاتا تھا۔تب میرے اندر، باہر میں کوئی وِرودھا بھاس نہیں تھا۔اُس وقت ہماری اپیکشائیں بھی کچھ اور تھیں مگر اب ایسا نہیں ہے۔ہماری ضرورتیں ہی نہیں۔ مقصد بھی بدل گئے ہیں۔ایک بڑے اخبار سے جُڑنے کے لیے جوڑ توڑ بھی کرنے پڑتے ہیں۔راج نیتی میں نے صرف سیکھی ہی نہیں اپنی آوشیکتا نوسار کرتا بھی ہوں۔میں تم سے اسپشٹ بتاؤں تو اس رُوپ کو دھارن کرنے سے پہلے میں بہتر ہندو تھا۔مگر نظر اب آرہا ہوں۔'' اوجھا نے یہاں پر بات ختم کی۔

''ایک دم سچ کہا تم نے۔۔۔یہی حال اِدھر ہے۔ بہت چھوٹے لڑکوں نے داڑھیاں رکھ لیں۔۔۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم ان سب سے زیادہ مسلمان ہو۔۔۔اوجھا نے خرم کی بات بیچ میں سے اُچک لی اور جُملہ پورا کیا۔

''ہم اندر سے کیا ہیں، یہ بہت معنی نہیں رکھتا۔ ہم نظر کیا آرہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے۔ یہی سیاست کی اَساس ہے۔اب خرم نے بولنا شروع کیا۔ پہلی بار تمھیں اس رُوپ میں دیکھ کر میں چونکا تھا۔ رات کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا بھی رہا۔ چوں کہ ہم بہت عرصہ کے بعد ملے تھے۔ وقت کا اثر کس پر کس طرح رہا اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تمھارے اس رُوپ کا پر بھاو اندر تک نہیں تھا، یہ میں دو دن پہلے نہیں سمجھ پا رہا تھا کیوں کہ اب سب کچھ ممکن ہے۔ میں اردو کے لفظ زیادہ استعمال کر رہا ہوں تمھیں Convey نہیں رہا ہو تو میں سوچوں۔'' خرم نے اپنی بات ختم کی۔

''بالکل نہیں۔۔۔۔ تمھیں یاد ہوگا اردو مجھے بچپن سے غزلوں کی وجہ سے بہت پسند تھی۔ سننے کا وہ شوق اور بڑھ گیا ہے اب۔۔۔۔ بس سے کا ابھاو رہتا ہے۔ اسکول کے زمانے میں تلفظ کے لیے تمھارے گھر میں کسی نہ کسی سے مدد لیا کرتا تھا۔ اخبار کی نوکری میں یہ شوق میرے کام بھی آیا''۔ اوجھا نے بات ختم کی۔ زبان کے دروبست سے اتنا تو واقف ہونا ہی چاہیے اور صحافت کے لیے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے۔'' اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بریانی آ گئی۔

''زیادہ گنجائش نہیں بچی ہے مگر اس بریانی کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔'' کہہ کر وہ بریانی کھانے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی۔ وقت کا سیال بھاپ بن کر اُن کے درمیاں سے اُڑ گیا تھا۔ واقعات اور اُن سے وابستہ باتیں ذہن کی کسی File میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لیے اُن کا ماضی شاید وہ معنی اور اہمیت نہ رکھتا ہو جو خرم اور اوجھا جیسے لوگوں کے لیے ہے۔

ریستوراں کا شور اُن کی یادوں کی بازیافت میں خلل نہیں ڈال سکا۔ وہ احساس جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ بہت سی باتیں ہم چاہ کر بھی نہیں کر پاتے صرف محسوس ہی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا اعتبار یا بے اعتباری ہمیں مثبت یا منفی بناتی ہیں۔

''یار اوجھا۔۔۔کیا ہونے والا ہے۔۔۔اس ملک۔۔۔۔۔۔میں۔۔۔؟'' خاصی دیر بعد خرم نے خاموشی توڑی۔ اُس کی آواز میں خوف و ہراس بھی تھا اور تشویش بھی۔

''یہ کون جانتا ہے۔۔۔اور دیش ہی کیوں۔۔۔۔۔پوری دنیا میں کہو۔۔۔۔ایک ہیجان کے نام پر الگ تماشا برپا ہے۔'' یہ اوجھا نے کہا۔

''اس قدر باخبر ہونے کے باوجود کسی کو کچھ نہیں معلوم۔؟'' یہ بات خرم نے کہی۔

بریانی کی خالی پلیٹ اوجھا نے سرکائی اور کولڈ ڈرنک کی بوتل پوری خالی کر کے میز پر رکھ دی۔ ایک بھرپور ڈکار لی۔ ''یار آج تو بس مزا ہی آ گیا۔ پھر سے Recharge ہو گیا۔ اتنی Overeating بہت زمانے بعد کی ہے۔ ہماری یادیں ہی جیون کا درشن ہیں۔ جلد ہی فیملی کو لے کر آتا ہوں۔''

''تم نہیں آؤ گے تو میں خود آ جاؤں گا اُنا مکا بھابھی سے ملنے۔۔'' کہہ کر خرم مسکرایا بھی۔ ویٹر نے بل لا کر رکھا۔ خرم نے تیزی سے جھپٹ لیا۔ حالاں کہ اوجھا نے بھی اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

''یہاں یہ نہیں چلے گا۔۔۔۔۔اب تم پردیسی ہو۔ تمھارے شہر میں یہ گستاخی میں نہیں کروں گا۔۔۔'' خرم نے تاویل پیش کی۔

''ٹھیک ہے باس۔۔۔۔۔'' اوجھا نے کہا اور دونوں نے کرسیاں چھوڑ دیں اگلے روز اوجھا کی واپسی تھی۔ ٹرین کی تفصیلات معلوم کر کے اور اسٹیشن آنے کا وعدہ کر کے وہ دونوں الگ راستوں پر نکل گئے۔ خرم کو وکیل کے پاس جانا تھا لیکن یہ بات اوجھا کو نہیں بتائی۔ پوری تفصیل بتانی پڑے گی۔ اس کے لیے اُسے یہ مناسب موقع نہیں لگا۔

●●●

فرقان کی ضمانت کی کوئی سبیل اب تک نہیں نکل پائی تھی۔ ساری تگ ودو ابھی تک ناکام ثابت ہوئی تھی۔ دن، ہفتے، مہینے سال بن کر گزرنے لگے۔ خرم نے وہ جدوجہد کی تھیں کہ آج کے زمانے میں کوئی اپنا بھی آسانی سے نہیں کرتا ہے۔ وکیل ریاض نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تاریخیں ملتی رہیں۔ بحثیں ہوتی رہیں۔ اتنی ساری سنگین اور پیچیدہ دفعات لگائی گئیں کہ اُن سے پار پانا بہت مشکل کام تھا۔ گواہان اور ثبوتوں کا بھی انتظام کروالیا گیا۔ ایک سماعت کے موقع پر خرم کو یقین سا تھا کہ آج رہائی مل جائے شائد اور اُسی دن یہ فرضی اور جھوٹے لوگ جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے۔ تمام اُمیدیں ختم ہو گئیں۔ ایک گہری سانس لے کر زیرِ لب اُس نے کچھ کہا تھا۔ وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا۔"

خرم نے اس کے بعد بھی ہار نہیں مانی تھی۔ جس قدر کوششیں ممکن تھی، اُس نے صدق دل سے کیں تھیں۔ ماموں سے تو کسی کا بَیر نہیں تھا لیکن خرم کے مراسم کی نوعیت اوروں سے الگ تھی۔ اُسی تعلق کے زیرِ اثر وہ فرقان کی قید سے نجات چاہتا تھا۔ ہر بار شکست خوردہ سا وہ واپس لوٹ جاتا مگر اگلی تاریخ تک خود کو سمیٹ کر پھر حاضر ہو جاتا۔

دوسری طرف فرقان حتمی طور پر نااُمید ہو گیا تھا۔ اس مایوسی اور ناکامی نے اُس کی صحت پر منفی اثر ڈالا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ صرف خرم سے بات کر لیتا تھا وہ بھی کئی بار پوچھنے پر۔ ورنہ زیادہ تر ہاں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔ سے کام چلاتا۔ اپنی رہائی کے تعلق سے وہ خرم سے کوئی سوال نہیں کرتا۔ بہت کچھ اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ خرم پر اُسے اپنے سے زیادہ اعتبار تھا۔ اس لیے وہ ایسے سوالوں سے گریز کرتا جو خرم کے لیے اذیت کا باعث ہوتے مگر فرقان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے بہت زیادہ رونے سے آنکھوں کے آس پاس جو سیاہ حلقے پڑے ہیں، انہیں دیکھ کر خرم کس کرب سے گزرتا ہے۔ چہرے کی شادابی اور معصومیت کو وقت کے نکیلے پنجوں نے کس قدر گہرے اور دائمی زخم دیئے ہیں۔

خرم نے ماموں کی طرف جانا بھی کم کر دیا تھا۔ وہ روز ایک ہی جواب دیتے دیتے تھک گیا تھا اور اب وہ اتنی ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔ جاتا بھی تو نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اُس کے ہاؤ بھاؤ ایسے ہو جاتے کہ جیسے فرقان کی اسیری کے لیے وہ ہی ذمہ دار ہے۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ ماموں کے پاس نہ جانے سے اُن کے خسارے اور بڑھیں گے مگر پھر بھی اس نے کمی کر ہی دی۔ خرم اب اُن دونوں کی ویران وسنسان آنکھوں میں مزید جھانکنے کی تاب نہیں رکھتا اور نہ ہی گویائی اور جھوٹ بولنے میں اُس کا ساتھ دے پا رہی تھی۔ لاشعور میں شائد اس طرح انہیں حقیقت سے روبہ رو کرانے کا خیال آیا ہو۔ اتنے دنوں تک کسی کی کوئی اُمید باقی بھی کیسے رہ سکتی ہے۔ سچائی جو تھی وہ دل خراش تھی، خرم بتانے کی ہمت کر بھی کیسے پاتا۔۔؟

دو وجود جن کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔ ٹمٹماتے چراغوں کی طرح اوپر نیچے ہوتا سانسوں کا زیر و بم۔۔ اور کم ہوتے ہوتے ایک روز بھبھک کر بجھ گیا۔ پہلے بیگم کلثوم۔۔ اور ایک ہفتہ بعد ماموں اس دنیا سے بیٹے کی رہائی کی آس لیے رخصت ہو گئے۔ رونے والے روئے بھی۔ اظہارِ افسوس بھی شدت سے کیا گیا۔ نمازِ جنازہ اور تدفین بھی نمٹ گئی یہ خبر فرقان کو بھی دینی تھی۔؟ اس کے بعد دیر تک وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی کیفیت میں جیسے رہا ہی نہیں۔

ایک دو دن بعد وہ ذہنی طور پر کچھ نارمل ہوا۔ اطلاع تو دینی ہی تھی اور یہ کام اُسے ہی کرنا تھا۔ اگلے دن وہ فرقان کے پاس گیا اور بغیر کچھ بولے اُس سے لپٹ کر رونے لگا۔ فرقان کو اندازہ ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ کسی لاش کی طرح کھڑا رہا۔ "کیا۔۔۔ ابا۔۔۔ بھی۔۔۔۔؟" خرم نے اتنا سنا تو اور زور سے اسے اپنی بانہوں میں دبا لیا۔۔۔ اور پھر جو فرقان نے رونا شروع کیا ہے۔ دل چیر دینے والی آواز۔۔۔ اور ذرا ہی دیر میں وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔ لوگ دوڑ کر اُس کے قریب آئے۔ پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ ہاتھ پیر سہلائے گئے۔ تھوڑی دیر میں اُسے ہوش آ گیا۔ اُسے پانی پلایا گیا۔ لوگ اُس کی ہمت افزائی میں لگے ہوئے تھے۔ فرقان نے آنکھیں کھول دی تھیں مگر پتھرائی سی آنکھیں۔ اُسے اُٹھا کر بیرک کے اندر لے گئے۔ خرم ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح تماشا دیکھتا رہا۔ چند ثانیوں تک وہ وہیں کھڑا رہا اور پھر اُسے باہر آنا ہی تھا۔

تھکے اور بھاری قدموں سے وہ جیل کے بڑے سے دروازے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

نو برس تین مہینے اور سترہ دن کے بعد فرقان کو جیل سے رہائی حاصل ہوئی۔ اس عرصہ میں کہاں کیا خارجی تبدیلیاں ہوئیں اس سے اُس کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہاں اُس کے اندر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ جس کی اُس کے لیے اہمیت تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ باہر خرم اور ریحان کے علاوہ کوئی اس کا انتظار نہیں کر رہا ہوگا مگر اُس کی خواہش تھی کہ اس خاص موقع پر کچھ اور لوگوں کو ہونا چاہیے۔

وہ پھاٹک سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ تیز کھلی ہوئی دھوپ، آزاد فضا کے باوجود وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اپنی رہائی کا جشن منائے یا والدین کو کھونے کا سوگ۔ کم و بیش ایک دہائی تک زنداں کی تاریک دُنیا میں رہ کر اب کھلے آسمان کے نیچے اپنی مرضی سے سانس لینے کی خوشی کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔ اپنے ماں باپ کا جزیہ ادا کر کے وہ باہر آیا ہے۔ اس خسارے کا احساس وہ کسی وقت بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال پاتا۔ دائیں بائیں دیکھتا ہوا وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ بے یقینی کی راکھ میں اُمید کی کوئی چنگاری شائد کہیں موجود ہو اور کوئی ایسا جس کا نام اور شکل اس وقت ذہن میں نہ ہو اور وہ اچانک مل جائے۔۔ اُس کے انتظار میں۔۔۔؟ فرقان نے ٹھہر کر اپنے اطراف کا باقاعدہ جائزہ لیا۔ ابھی تک تو خرم اور ریحان بھی نظر نہیں آئے تھے۔ ریحان کچھ عرصہ سے خرم کے ساتھ اُس سے ملنے آتا رہا تھا اس لیے اُس کی عدم موجودگی پر وہ تھوڑا فکر مند تھا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔؟ وہ اپنے طور پر خیالوں سے نبرد آزما تھا۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ انہیں اُس کے آج چھوٹنے کی خبر نہ ہو؟ اس خیال کی اُس نے خود ہی فوراً نفی کی۔ اُس کے لیے خرم ہی اُن لوگوں کا محسن اور خیر خواہ تھا۔ خرم سے زیادہ معتبر کوئی بھی اُن کے اتنے قریب نہیں تھا۔ کسی کے نہ آپانے کی بات اب اُسے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ یہاں نہیں آپائے؟ ادھیڑ بُن میں لگے رہنے کے باوجود کوئی تسلی بخش جواب وہ نہیں

تلاش کر سکا۔ باہر خاصی چہل پہل تھی۔ مختلف آوازوں کا شور اُسے متوجہ کر رہا تھا۔ اتنے عرصہ تک وہ یہ سب دیکھنے سے محروم رہا تھا مگر فی الحال کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پلٹ کر ایک بار بلند و بالا فصیلوں والی اسی عمارت کو نظر بھر کر دیکھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اُسے لینے کوئی نہیں آیا ہے۔ وجہ بھی معلوم ہو ہی جائے گی۔ اب یہاں کسی کا انتظار کرنا فضول ہے۔ اُسے یاد آیا کہ اُس کے پاس کچھ پیسے ہیں۔ غالباً خرم نے ہی دیے تھے۔ یہ راحت کی بات تھی ورنہ کرائے کے لیے سواری کا استعمال بھی مشکل ہوتا۔ اب اُسے جانے اور سواری کی ترتیب ہی دریافت کرنی تھی۔ جھولا سنبھالے وہ جیل کی حدود سے باہر نکل آیا تھا۔ گاڑیوں کا شور اب پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا تھا مگر فرقان کے؟

وہ چوکھٹ کے قریب آ کر ٹھہر گیا تھا۔۔۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ایک لحہ کو لگا کہ شائد وہ غلط گلی میں آ گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ چمن پرچون والے کی دُکان سامنے تھی۔ کچھ تبدیلیاں تو ہوئی ہیں مگر وہ اپنے ہی گھر کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ لوگ چہروں پر ماسک لگائے اُس کے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ کئی لوگوں کو وہ پہچان بھی گیا۔ کئی لوگوں نے اُسے بھی پہچانا۔ حال احوال پوچھ کر لوگ آگے بڑھ گئے۔ فرقان نے نوٹس کیا کہ لوگ گریز کر رہے ہیں۔ وجہ اُسے معلوم تھی۔؟

مکان کے ساتھ مکیں بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ اُس کا وہ پرانا اور بوسیدہ مسمار ہوتا ہوا گھر منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ اب وہاں ایک جدید طرز کا ٹائلز اور پتھروں سے آراستہ دو منزلہ خوبصورت مکان موجود تھا۔ یہ بات اُس سے کیوں چھپائی گئی، وہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ اُس نے اس غرض سے گھنٹی بجائی کہ شائد کوئی سراغ ملے۔ صاحبِ خانہ نے دروازہ کھولا تو اپنے تعارف کے ساتھ اُس نے آنے کا مقصد بھی بتایا۔ انھوں نے فرقان کو اندر بلا کر چائے پانی کرایا وہاں سے بھی اُسے کوئی خاطر خواہ جانکاری نہیں ملی۔ وہ ریحان کی تلاش میں تھا۔ وہ مل جائے تو تمام سوالوں کے جوابات ہاتھ لگ جائیں گے۔

کسی بیماری سے دفاع کے لیے چہروں کو ڈھکنا پڑ رہا ہے۔ ایسی اطلاعات اُسے

جیل میں ہی ملیں تھیں۔ یہاں تو اکثر لوگ اپنے چہروں کو پوشیدہ کیے ہوئے تھے۔ فرقان نے بھی اپنا چہرہ رومال سے ڈھک لیا تھا۔ اپنی شناخت کا جھگڑا اور معنویت فرقان کے لیے اسیری سے پہلے کچھ اور تھی۔ زنداں کی تاریکیاں زندگی کے نئے مفاہیم سکھا دیتی ہیں۔ فرقان ماموجیسے سیدھے سادے باپ کی اولاد تھا مگر دُنیا کو وہ خرم کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دن خرم نے بیرک میں اُس سے کہا تھا کہ "یہ وَبا نہ پھیلی ہوتی تب بھی لوگ شکل دکھانے کے لائق نہیں ہیں۔۔"

فرقان اُس گھر میں جو کبھی اُس کا تھا اس غرض سے بھی گیا تھا کہ کہیں سے اُس کے ماں باپ کی خوشبو مل جائے مگر وہاں تمام نقوش تاراج کر دیے گئے تھے۔ اب اُسے ریحان کو تلاش کرنا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک بات آئی کہ وہ پہلے خرم سے ملاقات کرے۔ اُن سے ریحان کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا، ان گلیوں میں اُس کا بچپن گزرا تھا۔ اس مقام کی اس کے لیے کیا اہمیت ہے یہ کسی زبان کے کسی لفظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ نم آنکھوں کو اُس نے اُسی رومال سے خشک کیا اور پھر سے منہ پر باندھ کر گلی سے نکلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اُس کے قدم خرم کے گھر کی طرف اُٹھ گئے۔ خرم کا گھر یہاں سے بہت دور تھا بھی نہیں۔

گھر کے باہر خرم کے بڑے بھائی شوکت جو خلیجی ملک میں رہتے تھے۔ ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی بلکہ وہ فرقان کو پہچان بھی نہ پائے۔ اُسے اپنے متعلق بتانا پڑا۔ انھوں نے بہت گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ فرقان کو تعجب کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ یہ خرم کے بھائی ہیں۔۔؟

"آپ کب آئے۔۔۔؟" فرقان کو بعد میں لگا کہ اُس نے غلط سوال کر لیا ہے۔

"مجھے آئے ہوئے تو سات برس ہو گئے۔۔ ہاں تم۔۔۔ جیل میں تھے اس لیے تمھیں نہیں معلوم ہو گا۔۔۔ تم کب چھوٹے۔۔؟" شوکت نے جواب دیا۔ "بس۔۔۔ آج ہی۔۔۔ وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔۔۔" فرقان نے کہا۔ "اچھا۔۔۔؟" اسکوٹر کی ڈگی سے

کچھ سامان نکالتے ہوئے وہ بولے۔ ''خرم ۔۔۔ چاچا سے ملنا ہے۔ کیا وہ گھر پر ہوں گے۔۔۔؟'' فرقان نے اپنے آنے کی غرض بیان کر دی۔

''گویا تمہیں کچھ نہیں معلوم ۔۔۔ ہاں تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم تو ابھی ۔۔۔'' فرقان نے یہیں سے اُن کی بات کاٹتے ہوئے پُوچھا۔۔۔ ''کیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ معلوم ۔۔۔ ہے مجھے؟'' چند لمحوں کا سکوت۔۔۔ شوکت کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور اُڑ گئے۔ ''سب خیریت۔۔۔ تو۔۔۔ ہے۔۔۔؟'' فرقان کے چہرے پر بھی نامعلوم اندیشے تیر رہے تھے۔

''خیریت۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ اور اب خرم بھی نہیں ہے۔۔۔ اس دُنیا۔۔۔ میں ''۔ رُک رُک کر بالآخر انھوں نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ یہ کسی ڈرامے یا فلم کا منظر ہوتا تو اسپیشل ایفیکٹس (Special Effects) سے اس بات کی ہیبت کا اظہار کر دیا جاتا۔ اُس کے پاس تو حیرت بھی نہیں بچی تھی۔ آنسو بھی ختم ہو چکے تھے۔

''آؤ۔۔۔ گھر۔۔۔ آؤ۔۔۔'' سامان کے تھیلے سنبھالے وہ فرقان سے مخاطب ہوئے۔ ''کب ۔۔۔ ہوا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔؟'' فرقان کی حلق سے لفظ پھنس کر باہر آئے۔ ''پچھلے جمعرات۔۔۔ کو۔۔۔''

''کیسے۔۔۔؟'' نحیف سی آواز نکلی جسے شوکت نہیں سُن پائے اور مُڑ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ فرقان اپنا جھولا سمیٹ کر ایک چبوترے پر کسی طرح بیٹھ گیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ نہیں بیٹھے گا تو گر ہی پڑے گا۔ یہ کیا بتا کر چلے گئے۔۔۔ خرم زندہ نہیں ہے۔ ۔۔۔ خرم ۔۔۔ مر بھی ۔۔۔ سکتا ہے کیا۔ تو پھر زندہ ۔۔۔ کون ۔۔۔ ہے۔۔۔؟'' گھٹنوں کے بیچ میں سر جھکا کر وہ بیٹھ گیا۔ گھُٹی گھُٹی کچھ سسکیوں نے باہر نکلنے کی جگہ بنائی اور پھر فلک شگاف چیخیں اس کمزور بدن سے کیسے نکلیں۔ شائد اُسے ہمیں دیکھنے کے لیے راہ گیر ٹھہر کر تماشا دیکھنے لگے۔ لوگوں کے لیے سب کچھ تماشا ہی ہوتا ہے۔ ایک دو حساس موبائل نکال کر ویڈیو بھی بنانے لگے۔ رومال اور قمیص کی آستین سے

آنسو پونچھ کر اشارے سے پانی طلب کیا۔ ایک لڑکے نے فوراً دکان سے پانی کی بوتل خرید کر اُسے پکڑائی۔ فرقان نے پوری بوتل خالی کر دی اُسے لگا تھا کہ پانی نہیں ملا تو شائد اس کا دَم ہی نکل جائے گا۔ لڑکے نے پُوچھا۔۔۔ ''اور۔۔لاؤں''۔۔اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ مجمع سے ایک بزرگ نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا ہے بیٹا۔۔۔کچھ پریشان لگ رہے ہو۔۔؟'' دس برس قید کے بدنما داغ اپنے چہرے پر وہ ابھی خود نہیں دیکھ سکا کہ یہ ایک ایسی خبر جس کو زبان سے دہرانا بھی اُس کے لیے فی الحال ممکن نہیں تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے شکر ادا کیا اور کسی بھی چیز کی ضرورت سے انکار کیا۔ لوگوں کو یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ کسی مصیبت کا مارا ہے۔ اپنا دُکھڑا کسی کے سامنے نہیں رونا چاہتا تو لوگوں نے ضد بھی نہیں کی۔ گھنی اور بڑھی بے ترتیب داڑھی اُس کی تشخیص میں رکاوٹ تھی ورنہ کئی لوگ اُسے پہچان چکے ہوتے۔ لوگ وہاں سے ہٹ گئے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ وہ بالکل تنہائی چاہتا تھا جہاں کوئی مخل نہ ہو۔

وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ سسکیوں سے روتا رہا۔ اُسے خرم کی ایک خاص بات یاد آئی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب طبیعت بہت اُداس ہو۔ رونے کا جی چاہے تو ندی کے کنارے چلے جانا چاہیے۔ وہاں ایسے لوگوں کی بھیڑ نہیں ہوگی جو دشواری کا سبب بنیں۔ پانی کی تیز دھار جانے کیوں سکون سا دیتی ہے۔ اُدھر جانے کا ارادہ تو کیا پر ابھی ہمت بھی جمع کرنی تھی، خرم کی موت فرقان کے لیے ایک انسان کے مرجانے کی اطلاع بھر نہیں تھی۔ ماں باپ کے بعد یہ ذمے داری اب خرم کو ہی نبھانی تھی ایسا فرقان نے سوچ رکھا تھا۔ خرم کا جانا اُس کے لیے ناخن کا گوشت سے جدا ہو جانے جیسا تھا۔ چاچا شوکت تو ایک خبر دے کر رخصت ہو گئے۔ وہ اتنی دیر نہیں ٹھہر سکے کہ بھائی کی موت کی وجہ بھی بتا دیتے۔ فرقان کو سب سے زیادہ یہی بات پریشان کر رہی تھی کہ اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ سودا جان دینے پر ختم ہوا۔ خرم کو کوئی بیماری، آزاری نہیں تھی۔ اُسے ریحان کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ اُس کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ وہ خوف زدہ بھی ہو رہا تھا۔ اُس نے

سوچا کہ چاچا شوکت کے پاس ہی چلے۔ کم سے کم حقیقت تو معلوم ہو۔ وہ ابھی اُٹھنے ہی والا تھا کہ کسی معجزے کی طرح ریحان اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس قدر جذباتی ہوئے کہ بے تحاشہ لپٹ گئے۔

''تم تھے۔۔۔۔۔کہاں۔۔؟'' فرقان کی آواز میں درد کے ساتھ تھوڑا شکوہ بھی تھا۔

''بھائی۔ وہ لمبی کہانی ہے۔۔۔گھر چل کر سب اطمینان سے بتاؤں گا۔۔۔''

''گھر۔۔۔کس کے۔۔۔۔گھر۔۔۔؟'' فرقان چونکا تھا۔

''عبید خالو کے گھر۔۔۔اب ہم وہیں رہتے ہیں اور آپ کو بھی وہیں رہنا ہے۔'' ریحان نے بتایا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک آٹو کو روکا۔ فرقان کو سہارا دے کر آٹو میں بٹھایا اور پھر بولنا شروع کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ ''عبید خالو ہم لوگوں کے خیر خواہ رہے ہیں۔ آخری دنوں میں اماں ابا کو وہ اپنے گھر لے گئے۔ مکان بیچ کر رقم امانت کے طور پر اُن کے پاس رکھی ہے۔ ہم جب چاہیں گے، وہ ہمیں دے دیں گے۔ خالہ شائستہ نے اماں سے وعدہ کیا ہے کہ ہم دونوں کو اپنے ہی گھر میں رکھیں گی۔ ہم لوگوں کے کام دھندے سے لے کر شادی بیاہ تک کی تمام ذمے داری انھوں نے ہی لے لی ہیں۔ خالہ نے مکان بیچ کروہ پیسہ اپنے استعمال میں لے لینے کی اماں کی تجویز سے انکار کر دیا تھا۔ ہمارے ساتھ اُن لوگوں کا سلوک بہت اچھا ہے۔'' ریحان نے لمبی بات ختم کی۔ عبید خالو کے بارے میں فرقان کی رائے بھی مثبت تھی۔ کم سے کم کوئی خبر تو راحت اور تسلی بخش ملی۔

''میں خالو کو چھوڑنے ایئر پورٹ گیا تھا۔ تین دن کے لیے کاروباری سلسلے میں انہیں دوسرے شہر جانا تھا۔ فلائٹ لیٹ ہوگئی جس کی وجہ سے میں آپ کی رہائی کے وقت نہ آسکا۔'' ایک اور گتھی ریحان نے سلجھادی تھی۔ ''مجھے بہت شدید بھوک لگی ہے مگر اُس سے پہلے میں خرم چاچا کی موت کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔۔؟'' فرقان جس بات کے لیے سب سے زیادہ فکر مند تھا وہ بات اُس کی زبان پر آ ہی گئی۔ ریحان نے آٹو ڈرائیور کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا تو گویا اُسے ابھی کچھ دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔

''گھر چلیے۔۔۔۔۔ پہلے کھانا وانا کھا لیجیے پھر اُن کی پوری اسٹوری سناتا ہوں۔''
ریحان کی بات سے وہ مطمئن نہیں تھا۔''اسٹوری۔۔۔۔۔تم۔۔۔سناتے رہنا۔۔۔مجھے شارٹ میں بتاؤ کہ اُن کی ڈیتھ کیسے ہوئی تھی۔۔؟''دھیمی آواز میں فرقان نے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی ریحان پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''انہیں بھیڑیے نے مار ڈالا۔۔۔۔''آخر کار ریحان کی تھرتھراتی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں پڑی''۔ بھیا یہیں سائیڈ میں روک۔۔۔لینا۔۔۔''ریحان نے آٹو والے سے رُکنے کو کہا۔آٹو فوراً رُک گیا۔دونوں باہر اُترے۔ریحان نے کرایہ ادا کیا۔آٹو آگے نکل گیا۔ریحان گھر کی طرف بڑھا۔کچھ قدم چل کر پیچھے دیکھا تو فرقان وہیں کھڑا ہوا تھا۔وہ واپس فرقان کے پاس آیا۔''رُک کیوں۔۔۔گئے۔۔۔بھائی۔۔۔؟'' ریحان نے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کوئی۔۔۔۔دو بار بھی یتیم ہو سکتا ہے۔۔۔؟''بغیر کسی تاثر کے فرقان کی زبان سے آواز باہر آئی۔

''بھائی حوصلہ رکھیے۔۔۔اللہ سب ٹھیک کرے گا۔''ریحان اپنے بڑے بھائی کی ذہنی شکست وریخت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''مری زندگی کے سب سے قیمتی دس سال جیل کی کال کوٹھری میں غارت ہو گئے مگر خرم چاچا کی موت میرے لیے اُس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔بھیڑیے نے انہیں ۔۔۔۔کیسے۔۔۔اور کیوں۔۔۔مار دیا۔۔۔ریحان تم یہیں رُک کر پہلے مجھے بتاؤ۔''فرقان نے چھوٹے بھائی کا ہاتھ دبایا بھی۔''وہ آٹو والا بھی چلا گیا ہے۔''ریحان نے دیکھا تھا کہ بڑے بھائی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔''خالہ کا گھر آ گیا ہے۔۔۔تھوڑا صبر کر لیں۔پہلے آپ کچھ کھا لیں۔۔۔''وہ دونوں گیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

خالو صاحب ثروت تھے۔گھر کی شان وشوکت سے ہی اُن کے تعیش کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔وہ ایک درد مند اور مخلص انسان تھے یہ خوبی انہیں زیادہ خاص بناتی تھی۔وہ

لوگ ماموں کے گھر برابر آتے رہتے تھے خالو اُن کی مدد بھی کرتے تھے۔ خالہ بڑی نیک دل خاتون تھیں اور شائد انھوں نے خالو کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔

فرقان کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی اور وہ بری طرح تھکا بھی تھا مگر وہ خرم کی موت کی تفصیل سب سے پہلے سننا چاہتا تھا۔ ریحان کو اس بات کا بخوبی اندازہ بھی تھا۔ وہ جان بوجھ کر ٹال مٹول کر بھی نہیں رہا تھا۔ سب سے پہلے غسل وغیرہ سے فراغت کروائی اور پھر کھانے کا انتظام کیا۔ خالہ شائستہ بھی کافی دیر تک پاس بیٹھ کر اُس کی دلجوئی کرتی رہیں۔ اُن کے طور طریقے سے فرقان کو خاصی تقویت ملی تھی۔ تھوڑی دیر میں یہ سب معاملے بھی نمٹ گئے۔

''بھیڑ نے کس لیے مارا۔۔۔انہیں۔۔۔؟'' ایک بار پھر فرقان نے سوال کیا۔

''آج کل۔۔۔۔بھیڑ۔۔۔کسی کو مارتی ہے اور کیوں مارتی ہے۔ ہم دونوں کو معلوم ہے۔'' بھائی۔۔۔آپ۔۔۔دس سال کی جیل کاٹ کے آگئے ہیں۔ کس لیے ۔۔۔یہ آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔۔'' گہرا سناٹا۔۔۔حیرت واستعجاب سے فرقان کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ ایک لمبی سانس لے کر ریحان پھر سے گویا ہوا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ بھیڑ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کچھ اگیات، اُنمادی اور آکروشت لوگوں نے یہ کرتیہ کیا ہے۔ جانچ کی جارہی ہے۔ دوشی بخشے نہیں جائیں گے۔ یہ معاملہ میڈیا نے کافی اُچھالا ہے۔ اس لیے بنا نام کے پولیس نے FIR تو درج کرلی ہے اور۔۔۔بس۔۔۔؟''

''یہ حادثہ کہاں اور کیسے ہوا۔۔۔۔یہ بتاؤ۔۔۔؟'' فرقان کے منہ سے کسی روبوٹ کی طرح یہ جملہ ادا ہوا۔

''خرم چاچا میسیتے کے یہاں سے گوشت لینے گئے تھے۔ انہیں کچھ کاغذات کی فوٹو کاپی بھی کرانی تھی۔ میسیتے سے گوشت نکالنے کا کہہ کر فوٹو کاپی کرانے گاندھی چوک تک چلے گئے۔ وہاں کچھ لڑکوں نے انہیں روک لیا۔ وہ چاچا کو جانتے تھے۔۔۔؟''

ریحان نے وقفہ لیا۔

اُن میں سے ایک بولا تھا کہ ''انترا سے تیرا کیا چکر چل رہا ہے؟ آئے دن یہ اُس کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ انترا نے مجھ سے شکایت کی ہے۔'' اس طرح کی باتیں وہ لوگ کر رہے تھے اور تبھی کسی نے خرم چاچا پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ ڈنڈے اور آہنی راڈ اُن کے پاس تھے اور پتہ ہے، مارنے والوں میں ایک دو لوگ چاچا کے جاننے والے بھی تھے۔ انھوں نے نام لے کر رحم کی بھیک مانگی تھی۔ کوئی ہبلو نام کا لڑکا بھی تھا جو اُن کے ساتھ پڑھا تھا۔ اُسی نے سر پر راڈ سے حملہ کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں چاچا لاش بن گیے۔ ریحان نے بات مکمل کی۔ ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ فرقان نے اپنے دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر گردن تھوڑی نیچے جھکا دی۔ صابر درزی کی دُکان اُسی چوراہے پر ہے۔ یہ ساری باتیں وہیں سے معلوم ہوئی ہیں حالاں کہ وہ خود بھی کافی ڈرے ہوئے ہیں کہ کہیں اُن کا نام نہ آجائے بعد میں پیش امام صاحب نے معاملے کو سنبھالا۔'' وہ رُکا تو فرقان نے گردن ذرا سی اوپر کر کے ریحان کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ انھوں نے کیا کر دیا۔

''وہ اتفاقاً اُدھر سے گزرے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں فون کر کے بلایا گیا تھا۔ بہر حال انھوں نے ہی پولیس کو فون کیا۔ ذرا دیر میں پولیس بھی آ گئی چوراہے پر ایک آدمی کی خون سے لت پت لاش پڑی ہوئی تھی۔ لوگ فوٹو اور ویڈیو بنانے میں مصروف تھے۔ پولیس نے پنچ نامہ بھرا۔ امام صاحب کے بیان درج کیے۔ خرم چاچا کے گھر والے بھی آ گئے تھے۔ اُن لوگوں کا مطالبہ تھا کہ پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے مگر پولیس نے یہ عرضی نامنظور کر دی۔ جلد ہی لاش کو ہٹوا کر آمد ورفت بحال کی۔ گھر والوں کو کچھ کاغذی خانہ پوری کے لیے پولیس تھانے لے گئی۔ امام صاحب سے بھی کہا۔

ایک بھی شخص نہیں ملا جو گواہی دیتا یا اُن کے گھر والوں کے لیے کوئی ایسی بات کرتا کہ اُن لوگوں کی ہمت افزائی ہوتی۔ خانہ پوری کے لیے آ گیا ت لوگوں کے خلاف

مقدمہ لکھ لیا گیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔

خرم چاچا کا جنازہ جب گھر پہنچا تو اماں دیکھ کر غش کھا کر گر پڑیں۔ سکتہ سا تو خبر سن کر ہی طاری ہو گیا تھا۔ کئی دنوں تک گریہ وزاری کا سلسلہ چلا۔ اُن کی موت سے لوگ بہت دکھی تھے۔۔

''انترا کے گھر۔۔۔ والوں کا کیا رول رہا۔۔۔؟'' فرقان نے سر جھکائے ہوئے پوچھا وہ لوگ سکندر چاچا سے ملے تھے۔ وہ لوگ بہت دکھی تھے اور حیران بھی۔ انترا تو سنا ہے بہت رو رہی تھی۔ کسی نئے مسئلہ سے بچنے کے لیے وہ لوگ کچھ دن کے لیے کہیں چلے گئے ہیں۔ اس حادثے کی ٹی وی پر بھی یہ خبر آئی تھی۔ اخباروں میں تو کئی دن تک چھپتا رہا تھا۔ چاچا کی میت میں اتنا آدمی تھا کہ اس محلے میں آج تک کسی کے جنازے میں اتنی بھیڑ نہیں دیکھی گئی۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ریحان کی باتیں فرقان سر جھکا کر سنتا رہا۔ خاموشی سے اُس کے آنسو نیچے گرتے رہے۔ ریحان کو کچھ شبہ ہوا تو وہ بولا ۔۔۔''بھائی ۔۔۔۔ اُس نے فرقان کی پشت پر ہاتھ بھی رکھا۔۔۔ کیا ہوا ۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔؟'' دوبارہ کہنے پر فرقان نے گردن اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ دو موٹے موٹے آنسو اُسی وقت نکل کر زمین پر گرے۔ صبر وضبط کے آنسو ہوں یا مظلوم کے، یہ کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاتے ضرور ہیں۔ خرم۔ نہیں دیکھ پائے گا وہ دن۔ ہو سکتا ہے فرقان بھی نہ دیکھ پائے مگر ان لوگوں کا یقین ضرور باقی رہے گا۔

●●●

فرقان ندی کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔خرم کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''جب کبھی جی اُداس ہو کسی سے بات کرنے کی خواہش نہ ہو تو نہر کے کنارے چلے جانا چاہئے۔'' اور وہ آگیا۔ ریحان اور خالہ نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ لوگ ہار گئے۔ ریحان ساتھ میں آیا تھا مگر وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔فرقان اس کیفیت کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔

کسی انسان سے کتنی محبت ہے۔ تعلق اور وابستگی کا ادراک کیا اُس کے منظر سے غائب ہو جانے کے بعد زیادہ ہوتا ہے؟ چاچا خرم فرقان یا اس کے گھر والوں کے لیے بہت مخلص اور مشفق تھے۔فرقان خود بھی محبت کے ساتھ اکرام بھی کرتا تھا مگر موت کی خبر سننے کے بعد سے صورتِ حال کچھ اور ہی ہو گئی ہے۔موت تو اس کے والدین کی بھی ہوئی تھی۔اُن کا غم اور خسارہ خالق کائنات نے طے کر دیا ہے۔ ماں باپ مریں یا اولاد ۔۔۔وہ دُکھ فطری ہیں۔ مگر خرم سے کون سا رشتہ تھا۔۔۔؟ ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور آوازوں کی بازگشت جنہیں چھونے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ تتلیوں کی طرح حواس پر رنگ چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہیں۔

فرقان خیالوں کی دُنیا سے لوٹ کر ندی کی طرف آتا ہے۔ وہ غور سے ندی اور اطراف کے مناظر پر نظر ڈالتا ہے۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کون سی ندی ہے۔ یہ وہ ندی تو ہر گز نہیں جس کی حمایت خرم کیا کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بے شمار لاشیں تھیں۔ بدبُو کا تیز بھبکا اُس کی ناک تک آیا۔ کچھ لاشیں پھولی ہوئی بھی تھیں۔ کچھ سے گوشت غائب تھا۔ کُتے، چیل، کوّے نوچنے کھانے میں مصروف تھے۔ جا بجا ہڈیوں کا ڈھیر بھی نظر آیا گویا کافی پہلے سے یہ لاشیں یہاں پھینکی جا رہی ہیں۔ کیچڑ اور غلاظت میں لپٹے ہوئے انسانی اجسام اور ڈھانچے۔۔۔ تعفن سے بھری یہ فضا۔ کراہیت اور ہیبت سے فرقان کی تھرتھری چھوٹ گئی۔

یہ مردہ جسموں کا انبار صرف وبائی آفات کا تو نہیں تھا۔ سسٹم کے ہر آدمی نے جس کے پاس کسی بھی طرح کی طاقت تھی، اس نے اپنے کمزور کا قتل کردیا تھا۔ اموات جب انتظامات سے زیادہ ہونے لگتی ہیں تو آخری رسومات اسی طرح انجام پاتی ہیں۔ بالو میں دبائی گئی لاشیں پانی کے چھینٹوں سے باہر جھانکنے لگی تھیں۔ مردہ کھانے والے جانور اور پرندے اپنے آپ پہنچ جاتے ہیں۔

فرقان نے بہت سی تدفین دیکھی ہیں داہ سنسکار بھی دیکھے ہیں۔۔ بے گناہ ہو کر جیل میں دس برس کا ناقابل بیان کرب جھیلا ہے مگر یہ منظر تو شائد کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں۔ اُسے لگا یہ سب خرم کی لاشیں ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے۔ یہ بے شمار لاشیں جنہیں کسی نہ کسی ناانصافی نے مار دیا۔ یہ سب۔۔۔ خرم۔۔۔ ہیں۔۔۔؟

دُور بہت دور سورج منظر سے غائب ہونے کی کوشش میں تھا۔۔۔ ایک آگ کا گولا۔۔۔ اُفق پر زردی بکھیرتا ہوا۔ لمحہ بہ لمحہ۔۔۔ شام کا دُھندلکا پھیلتا ہوا۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔۔۔ سائے معدوم ہو رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بدبُو اور زیادہ پھیلتی جارہی تھی ایک اک مردے پر کئی کئی کتے ایک ساتھ جھپٹ رہے تھے۔ بھونکنے کی آوازیں جھگڑنے کی شکل میں سُنائی دے رہی تھیں۔ تیز۔۔۔ اور تیز۔۔۔ ہوتی ہوئیں۔۔۔ آسمان سے ایک سیاہ چادر پھیلا دی گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑا ایک انسانی وجود۔۔۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی رونے کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ وہ انسانی وجود۔۔۔۔ سے پیکر اور پھر سائے میں تبدیل ہو کر تاریکی میں اُسی کا حصہ بن گیا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا۔۔۔۔ فضا میں صرف کتوں کی آوازیں باقی بچی تھیں۔۔۔ کرخت۔۔۔ اور خوفناک آوازیں۔۔۔۔ جو تیرگی میں اور زیادہ ہراساں کرتی ہیں۔۔۔؟

●●●

شاہد اختر کی تحریریں گہرے اندھیروں میں
بھی روشنی کی کرنوں سے دور نہیں ہوتیں۔
جس کو دردمندیوں نے فنکارانہ آب و تاب
عطا کی ہے۔ان کی تحریریں بھی مجھے پسند ہیں
اور ان میں جس زبان کا استعمال کیا گیا ہے،
اسکی روانی سادگی اور شفافیت بھی متوجہ
کرتی ہے۔

ندا فاضلی

مصنف کی دیگر کتابیں

1۔برف پر ننگے پاؤں (افسانے) 2012

2۔شہر میں سمندر (ناول) 2005

3۔موتی (افسانے) 2004

4۔خواب گینے (افسانے) 2017

5۔برف پر ننگے پاؤں (افسانے دیناگری میں) 2019

شاہد اختر نئی نسل کے ایک تازہ کار افسانہ نگار ہیں جو اپنی تخلیقات سے چونکاتے ہی نہیں سبھوں کی توجہ اپنی طرف مبذول بھی کروا لیتے ہیں۔شاہد اختر فکشن کی عصری حسیت سے آگاہ اور اظہار و بیان کی جمالیات کے رمز آشنا ہیں۔شاہد اختر بڑی تپیا کے بعد فکشن کی آرادھنا میں سپھل ہوئے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

1990 کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں ان میں شاہد اختر کا نام سب سے نمایاں ہے۔وہ بہت بہتر لکھ رہے ہیں۔

پروفیسر نیر مسعود

Shahr-e-zaat (Novel)
by Shahid Akhtar

ISBN 93-9399883-3
9 789393 998835

+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com
arshiapublicationspvt@gmail.com